از

مولانا عبدالماجد دریابادی

ناشر: مولینا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی رجسٹرڈ لکھنؤ

ڈھائی ہفتہ پاکستان میں

یا

مبارک سفر

از

مولانا عبدالماجد دریابادی

ناشر: مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی رجسٹرڈ لکھنؤ

دُوسرا ایڈیشن: —— پانچ سو

ماہِ اشاعت: —— اپریل ۱۹۸۱ء

ناشر
مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی
۸- کچہری روڈ، لکھنؤ

زیرِ اہتمام
حسین قدوائی نامی پریس نخاس، لکھنؤ
میں طبع ہوئی

قیمت: دس ۱۰ روپیہ

فہرست

دیباچہ طبع ثانی

"ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" کے پہلے اڈیشن کا دیباچہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں تحریر ہوا تھا۔ اشاعت کی نوبت چند ماہ بعد آئی۔ کتاب ہندو پاکستان دونوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ کئی سال ہوئے اس کا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا تھا اب اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۸۱ء میں مولانا عبدالماجد اکاڈمی شائع کررہی ہے اکاڈمی کی مطبوعات میں یہ پانچویں ہے۔

اس سفرنامہ میں جن حضرات کا نام آیا ہے۔ ان کی بہت بڑی تعداد اس جہاں فانی سے اس پچیس ساڑھے پچیس سال کے عرصہ میں راہئی ملک بقا ہوچکی۔ اور ان مرحومین میں آخری اور ایک اہم نام چودھری مبارک علی خاں (ملگنڈہ) کا ہے جنھوں نے ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔ ان چودھری صاحب کا ذکر طبع اول کے دیباچہ میں مولانا مرحوم نے بڑی احسان مندی سے کیا ہے کیونکہ اس کتاب کا مسودہ انھوں نے بڑے پاکیزہ خط میں صاف کیا اور اس میں نقشوں کا اضافہ کیا تھا۔ کتاب کا دوسرا نام انھیں کی تجویز پران کے نام کی رعایت سے "مبارک سفر" رکھا گیا تھا۔

کتاب اردو کے سیاحتی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اتنی مدت گزرجانے کے بعد بھی اس کی دلچسپی جوں کی توں قائم ہے۔

کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں اکاڈمی کے فعال ترین رکن حسین قدوائی دریابادی سلمہ اللہ کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر و مستحق ستائش ہیں۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

۲۰ مارچ ۱۹۸۱ء

دیباچہ
(طبع اوّل)

ایک مختصر سے ڈھائی ہفتہ کے سفر کی داستان، شاید لکھنے والے کی طول بیانی کے باعث بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی اور صدق کے دسٹس نمبروں میں بمشکل ختم ہو پائی پڑھنے والوں کو خدا معلوم کیا لذت اس میں ملی کہ عین اس کی قسط وار اشاعت کے وقت وہ پاکستان کے تو بہ کثرت اور ہندوستان کے بھی دو ایک پرچوں میں نقل ہوتی رہی اور پسند کرنے والوں کے خطوط بڑی تعداد میں وصول ہوتے رہے پسند کا اظہار تقریبًا ہر طبقہ کی طرف سے ہوا۔ اور بہت سے کرم فرماؤں کا اصرار یہ ہوا، کہ ان متفرق مضامین کو یکجا کر کے مستقل کتاب کی شکل دیدی جائے آئندہ اوراق اسی ارشاد کی تعمیل ہیں۔ ادھر اس سفر نامہ کی آخری قسط نکلی ہی تھی کہ ادھر پاکستان کی دنیا ہی بدل گئی۔ نہ وہ گورنر جنرل رہ گئے۔ نہ وہ وزیر اعظم۔ ریل کے کچھ ڈبے کلکتہ سے براہ راست لاہور چلنے لگے۔ راستہ کی دشواریاں بھی کم ہو گئیں چیکنگ اٹاری اور جلّو سے امرتسر اور لاہور منتقل ہو آئی۔ وقس علیٰ ہذا۔ ناظرین کرام ان تبدیلیوں کو ذہن میں رکھیں ——— نظر ثانی کے وقت لفظی ترمیم تو کثرت سے ہوئی ہی ہے۔ کہیں کہیں کئی کئی سطروں کا اضافہ بھی ضروری نظر آیا۔

صدق میں چھپے ہوئے ایک ضمیمہ کو اصل کتاب کا جزو بنا دیا گیا ہے اور دو نئے ضمیمے بڑھا دیے گئے ہیں۔

کتاب جیسی کہ وہ شائع ہو رہی ہے۔ بڑی حد تک رہین منت ایک نادیدہ حیدرآبادی مخلص، چودھری مبارک علی خاں (فیض منزل۔ نلگنڈہ) کی ہے۔ انھوں نے اتنا ہی

نہیں کیا، کہ کل کتاب کا مسودہ نہایت پاک وصاف لکھ کر بھیج دیا۔ اور اس میں ترمیم و حذف و اضافہ میں مجھے بڑی آسانی رہی۔ بلکہ طرح طرح کی گلکاریاں بھی بڑی محنت وکاوش سے کیں اور تاریخیں نکال کر کتاب کے کئی نام اپنی طرف سے تجویز کر دیے۔ ان میں سے صرف ایک نام "مبارک سفر" کو قائم رہنے دیتا ہوں جس سے خود ان کے نام کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ بعض نقشوں کا اضافہ بھی تمامتر انھیں کی جدت ہے۔

ظاہر ہے کہ جس کتاب میں اس کثرت سے اشخاص اور مختلف فرقوں اور پارٹیوں اور اداروں کا ذکر آئے گا، اس سے ہر پڑھنے والا متفق نہیں ہو سکتا، اور نہ لکھنے والا ہی اتنے سرسری اور وقتی مشاہدے سے اپنی رائیں پوری پختگی اور ذمہ داری سے قائم کر سکتا ہے۔ بہرحال جو صاحب سمجھیں، کہ ان کے حق میں انصاف نہیں ہوا ہے، وہ از راہ کرم خود ہی عفو و درگزر سے کام لیں۔ یا اگر کسی بیان کی تردید ضروری خیال فرمائیں تو لکھ بھیجیں۔ تصحیح و اصلاح دوسرے ایڈیشن میں ممکن ہے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء

عبدالماجد

(۱)

تقریبِ سفر پر طرح طرح کی طبع آزمائیاں

پاکستان کے موجودہ فرمانروا ہز ایکسلنسی ملک غلام محمد ایک زمانہ میں سرکار ہند میں ریلوے فنانس میں کسی اونچے عہدہ پر تھے اور قیام لکھنؤ میں رہتا تھا چودھری خلیق الزماں کے مکان پر۔ ان کے اُن کے تعلقات دوستی کی حدود سے گزر کر سگے بھائیوں کے سے ہو چکے تھے اسے آج مدت تیس اکتیس سال کی ہوگئی اپنا تعلق اس وقت تحریک خلافت سے خصوصی طور پر تھا صوبۂ اودھ کی خدمت صدارت سپرد تھی اور چودھری صاحب تحریک کے ایک مسلّم لیڈر تھے اس تقریب سے اپنا سلسلۂ آمدورفت چودھری صاحب کے یہاں لگا رہتا اور ضمناً ملک صاحب سے نیاز حاصل ہوجاتا یہ کائنات ہے اپنے اُن کے تعلقات کی، اور شرافت نفس و ذرہ نوازی کا کمال ہے کہ وہ اس تھوڑے کو بہت سمجھے اپنے جاہ و حشم کی ترقیوں کے ہر دور میں اسے یاد رکھا یہاں تک کہ اب جب وہ اس مرتبۂ جلیل پر ہیں انھوں نے اپنے اس قدیم اور اب بالکل ایسا سا گوشہ نشین نیازمند کی یاد باقی رکھی۔ اور شروع جنوری میں اسے عنایت نامہ سے سرفراز کر کے وسط مارچ میں اسے کراچی آنے کی دعوت دیدی ـــــ کئی ہفتہ حیص بیص میں گزرے اور بالآخر وسط فروری ۱۹۵۵ء میں منظوری شروع اپریل ۱۹۵۵ء میں حاضری کی لکھ بھیجی اور اپنا ڈھائی ہفتہ کے سفر کا پروگرام، روانگی اور واپسی کی تاریخوں بلکہ ٹرینوں کے تعین کے ساتھ لکھ دیا ـــــ زیارت پاکستان کی تمنا کس مسلمان کے دل میں نہیں؟

سرگیسوے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ایک تو مسلم ملک پھر پڑوسی اور پڑوسی بھی کیسا، اپنے ہی گوشت پوست کا پتلا، اپنے ہی دل و جگر کا ٹکڑا۔ اپنے کتنے بھائی بند، عزیز دوست، مخلصین اس سرزمین پر آباد اور پھر قائم اسلامیت کے کن کن دعووں اور کیسے کیسے وعدوں کے ساتھ ہوا تھا! یہ سب چیزیں مل ملا کر اشتیاق دید کو حد کمال تک پہنچائے ہوئے۔

از غم عشق تو پُر خون جگرے نیست کہ نیست

ساتھ ہی مانع بھی چند در چند موجود، سب سے بڑا مانع فرصت کی کمی۔ آخری فیصلہ بڑے سوچ بچار کے بعد یہی ہوا کہ اسے بھی ایک ضروری کام سمجھ، ڈھائی ہفتہ کی رخصت دوسرے کاموں سے لی جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو، اس دیرینہ شوق کو اس بار پورا ہی کر لیا جائے!

خبر کا پھوٹنا تھا کہ نزدیک و دور یہاں اور وہاں، ہر رنگ کی طبع آزمائی شروع ہو گئی اور طرح طرح کی گلفشانی ہونے لگی۔ بہ قول شخصے

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے

اور لازمی نتیجہ کے طور پر

سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

پورا نقشہ "چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" کا جما ہوا۔

ایک صاحب نے اندازہ کا تیر چلایا کہ ہو نہ ہو آپ کی طلبی شیخ الاسلام کے عہدہ کے لیے ہو رہی ہے اور دیکھیے کہیں انکار نہ کر بیٹھیے گا، جگہ بہت اچھی ہے، مشاہرہ معقول اور کام برائے نام! ـــــ ایک دوسرے صاحب اس سے بھی دور کی کوڑی لائے، بولے بھوپال میں تو یہ خبر عام ہے کہ عہدۂ قاضی القضاۃ کی پیش کش آپ کے لیے ہوئی ہے"---

گویا "شیخ الاسلام" اور "قاضی القضاۃ" نام کے عہدے تو حکومت پاکستان میں موجود ہی ہیں
——— گویا اس بےعلم و بےعمل کو مناسبت تام بھی ان عہدوں کے ساتھ موجود ہے! ———
اور گویا مدۃ العمر کے معمول کے خلاف اب یہ گوشہ نشین کوئی سرکاری عہدہ لپک کر قبول بھی کرے گا!
——— ناصحین مشفقین کو اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی، کہ ایسے کھلے ہوئے اور بنیادی سوالات پر ادنیٰ غور و فکر بھی کریں۔ تخیلہ نے ایک چلتی ہوئی چیز پیش کر دی اور قوم چشم بد دور مدت سے انھیں کھلونوں سے کھیلنے کی عادی ہو چکی ہو! انٹی بوستان خیال تصنیف کرنے والوں کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ جب پاکستان آئے ہیں تو اس سے کچھ ہی مدت قبل، ریاست بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے، بس لازم آیا کہ مملکت پاکستان میں کوئی عہدہ اس نام کا موجود ہو اور اب وہ ان کے ایک دیرینہ رفیق و نیاز مند کو تفویض ہو!
اپنے کو مناسبت کسی درجہ میں بھی اگر کسی عہدہ کے ساتھ ہو سکتی تھی تو اس کی صورت صرف یہ تھی کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے نمونہ کا کوئی دوسرا دار التصنیف پاکستان میں کھلتا اور اس کی نگرانی اس نامہ سیاہ کے سپرد ہوتی، باقی اس کے سوا کسی قسم کے فقیہانہ، خطیبانہ، واعظانہ، حاکمانہ یا انتظامی منصب سے مناسبت تو اس عاجز کو سو میں ایک درجہ کی بھی نہیں!
——— ایک تیسرے گروہ کا انکشاف تھا کہ "حکومت جس قسم کے دستور اساسی کو پاس کرانا چاہتی ہے آپ اس کی تصدیق و تصویب کے لیے طلب ہوئے ہیں تاکہ وہاں کے علما جب اس دستور کے خلاف چیخ پکار کریں تو ان کا منہ بند کرنے کو آپ کے تصدیقی دستخط پیش کر دیے جائیں"!
——— اور چوتھے گروہ کی تحقیق تھی کہ "آپ جماعت اسلامی اور مودودی پارٹی کا زور توڑنے کے لیے بلائے گئے ہیں" ——— اور پانچویں گروہ کے نمایندوں نے اعتماد کے لہجہ میں سرگوشی کی "آپ سے ملک کی مذہبی صورت حال سے متعلق استصواب رائے یقیناً ہو گا۔ ذرا

خیال کر کے علماء کے حق میں کلمۂ خیر کہہ دیجئے گا اور خصوصاً مظلوم مولانا مودودی کی خوب پذیرائی پر توضرور رد دیجئے گا" ___ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، جتنی زبانیں اتنی کہانیاں ___

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من

وز درونِ من نجست اسرارِ من

خوب خوب افسانہ تراشیاں تھیں اور خیال آرائیاں جن کے جھرمٹ میں رختِ سفر بندھا اور سفرِ پاکستان کا پہلا قدم اُٹھا۔

واہمہ کی ان ساری خلاقیوں کی آخر بنیاد کیا تھی؟ صرف یہ مفروضہ کہ حاکمِ اعلیٰ جب کسی کو بلائے گا تو ضرور ہی کوئی نہ کوئی ملکی یا سیاسی غرض اس میں شامل ہوگی، جیسے ذاتی محبت دوستی اور شخصی پسند دل جیسی چیز حکامِ والا مقام کے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتی، جیسے حاکمیت انسانیت کو ڈھکیل کر پورا میدان صاف کر دیتی ہے! اور ہم سبقی، ہم وطنی، ہم صحبتی قسم کے الفاظ اربابِ حکومت کے ہاں بالکل بے مفہوم رہ جاتے ہیں! ___ گویا ڈاکٹر کے ہاں جب کوئی جائے تو ہمیشہ اپنا حال ہی کہنے! اور ڈاکٹر جب کسی کو بلائے تو لازمی طور پر علاج ہی کرنے! اور گویا ڈاکٹر کا کسی انسان سے بحیثیت دوست کے ملنا اور اس کی مکالمت و مجالست سے لطف اٹھانا از قبیل محالات ہے۔

اپنا یہ معمول کم سے کم احبابِ خصوصی کو تو معلوم ہی ہے کہ خطابِ خاص میں سبقت کرتا نہیں ہے۔ خطابِ عام جتنا بھی بن پڑتا ہے صدق اور دوسری تحریروں کے ذریعہ برابر ہوتا ہی رہتا ہے لیکن خطابِ خاص کے لیے کوئی وجہ موجہ ضروری ہے۔ جن عزیزوں قریبوں کی تلقین و تربیت اپنے ذمہ واجب ہے ان کی صورت دوسری ہے۔ باقی اس محدود دائرے کے باہر خطابِ خاص تو جب ہی ممکن ہو کہ یا تو ادھر سے کوئی سوال پیش ہوا، اور اس کے جواب میں

اپنی فہم وعلم کی بساط کے موافق کوئی مشورہ یا گزارش پیش کی جائے اور یا پھر وہ مسئلہ دینی یا دنیوی حیثیت سے اہمیت ہی اتنی غیر معمولی رکھتا ہو کہ خاموشی گناہ کے درجہ میں پہونچ جائے ان خصوصی صورتوں کو چھوڑ کر بلا طلب مشورہ کسی کے معاملات میں دخل دینا اور اس پر اپنے مشورے ٹھونسنا اپنی وضع و معمول کے بالکل خلاف ہے۔

عزت مآب ملک صاحب سے سیاسی مباحثے اور مذاکرے زندگی کے کسی دور میں بھی نہیں رہے اور نہ وہ کبھی اس بے ہنر کو اپنا اتالیق یا مرشد سمجھے اس لیے انکے دعوت نامہ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا تھا ایک با اقتدار کرم فرمانے چاہا کہ اپنے ایک قدیم نیاز مند کو اپنے ملک کی سیر کرادے۔ اور اس ملک کے اندر اس کے جو بے شمار محب و مخلص و عزیز موجود ہیں ان سے ملنے جلنے کا موقع فراہم کر دے۔ اور بس اس کے لیے بے تکلف بلا بھیجا چلئے چھٹی ہوئی ــــــ لیکن جو قوم دن رات "سنسنی خیزی" کی بھوک میں مبتلا رہتی اور ہر سیدھی اور موٹی سی بات میں عجائب دیکھنے اور خوارق تلاش کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔ اس کی تسکین اس سادہ توجیہ سے کیونکر ہو سکتی تھی۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لِم نکالتی اور ڈوب ڈوب کر فیہ پیدا کرتی رہی۔ اور ارضِ "پاک" کا مسافر سب کچھ سنتا اور دل ہی دل میں مسکراتا، سفر کی پہلی منزل کو روانہ ہو گیا۔

——:۔(۲):۔——

مشکلات راہ۔ واقعات وواردات

ابھی سفر کا قدم ابھی اٹھا کہاں۔ پاکستان اب ایک غیر ملک ہے غیرت بھی ایسی جو طرح طرح کی بدگمانیوں کے تہ بہ تہ پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہاں کا سفر کیا کچھ آسان ہے کو بس ٹکٹ لیا اور چل کھڑے ہوئے! اجازت ناموں کی وہ وہ کڑی منزلیں درمیان میں کہ اچھے اچھے ہمت اور حوصلہ والوں کے بھی صبر کا پورا امتحان ہوجائے! لاہور اور کراچی ابھی کل تک بمبئی اور کلکتہ ہی کی طرح اپنے تھے لیکن اب جو حجابات حائل ہیں، ان کے لحاظ سے تو شاید لندن بلکہ نیویارک تک پہنچ جانا اس سے آسان تر ہو!—— اجازت پہلے تو اپنی ہی حکومت سے حاصل کیجئے اور عملاً اس کے سامنے ثابت کیجئے کہ آپ چور، اچکے، بدمعاش اٹھائی گیرے نہیں ہیں —— پاسپورٹ (پروانہ راہداری) کا فارم کسی طرح اپنے حاکم ضلع کے دفتر سے حاصل کیجئے اور اس کی خانہ پری یوں کیجئے کہ جیسے آپ جرائم پیشہ یا کم سے کم مشتبہ ضرور ہیں اپنا قد ناپ کر لکھئے، بالوں کا رنگ بتائیے، آنکھوں کے رنگ کی صراحت کیجئے۔ اور آپ کا مذہب اجازت دے یا نہ دے اپنے فوٹو تین تین سد کھنچوا کر شامل کیجئے اور پھر اس جھوٹے اعلان پر دستخط کیجیے کہ آپ کو سفر پاکستان کی "شدید ضرورت" ہے! اس کے بعد اب صوبہ سکریٹریٹ کے چکر لگانے شروع کیجئے کہ پاسپورٹ تیار ہوکر آپ کو ملے۔ پھر جب خدا خدا کرکے ان سارے مرحلوں سے فراغت پالیجئے تو اب اجازت حکومت پاکستان سے بھی وہاں داخلہ کی حاصل کیجئے اسکا

اصطلاحی نام ویزا (VISA) ہے اور آپ کہیں بھی ہوں۔ اس غرض سے خاصہ طویل سفر دہلی کا پاکستان کے ہائی کمشنر کے دفتر کے لیے کیجئے! ـــ جب خودداری کا خون یوں قدم قدم پر ہو لے ۔۔ اور وقت اور روپیہ دونوں کا صرف اچھا خاصہ ہو چکے جب کہیں آپ اس قابل ہوں گے کہ سفر کا پہلا قدم اٹھا سکیں! اب پلٹ کر سوچتا ہوں تو اپنے اوپر حیرت سی ہوتی ہے کہ ایک عافیت پسند و عافیت کوش گوشہ نشین سے یہ ہفتوں کی ساری منزلیں سر ہوئیں کس طرح!

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

یہ صحیح ہے کہ ادھر عزیزوں، مخلصوں کا گروہ، سکریٹریٹ وغیرہ کے مرحلے طے کرانے میں برابر ساعی و سرگرم ہوا اور ادھر پاکستان کے ہائی کمشنر صاحب بنفس نفیس ہی نہیں بلکہ ان کا دفتر بھر مہربان۔ بلکہ ایک اہل کار صاحب دہلی سے دریاباد تک سفر کی زحمت بھی اس سلسلے میں گوارا کر چکے تھے پھر بھی ضابطے ضابطے ہی ہوتے ہیں اور سرخ فیتہ کی سنگلاخ زمینوں سے عہدہ برآ ہونا مخلصوں کی ہر اعانت کے باوجود بھی آسانی سے ممکن نہیں ــ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں!

سفر بالکل تنہا کرنا نہ تھا، شریک حیات، شریک سفر بھی ہو رہی تھیں اور پاکستان کی مجھ سے بڑھ کر حریص و آرزومند پھر لاہور اور کراچی کے مختصر قیام کا جو نقشہ پیش نظر تھا اور قلیل مدت کے اندر احباب و مخلصین کے ہجوم عظیم کو ایک نظم کے ماتحت جس طرح نپٹانا تھا

اس کے لحاظ سے ایک ہمہ وقتی سکریٹری کی رفاقت ناگزیر تھی۔ چنانچہ اس کے لیے نظرِ انتخاب اپنے بھتیجے اور داماد محمد ہاشم قدوائی ایم لے (استاد پولیٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پر پڑی ان کے علاوہ سامان کی نگہداشت آثار چڑھاؤ اور عام آسائش کے خیال سے دفتر صدق کے ایک کارندے کو بھی ساتھ لیا ـــــ چار آدمیوں کے اس قافلہ کے لیے ہوائی جہاز سے سفر خارج از بحث تھا۔ لکھنؤ سے لاہور کا وہی قدیم اور ایک زمانہ میں مانوس و محبوب راستہ ریل کا اختیار کیا۔

اپریل کی پہلی اور شعبان کی ساتویں تھی کہ بعد نماز جمعہ سہ پہر کی ٹرین سے لکھنؤ سے امرتسر کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ وہی ٹرین جو تقسیم ملک سے قبل سیدھی لاہور جاتی تھی اور کلکتہ پنجاب میل کہلاتی تھی ـــــ پلیٹ فارم پر عزیزوں، دوستوں، مخلصوں، رخصت کرنے والوں اور والیوں کا وہ ہجوم کہ جیسے پاکستان نہیں حج و زیارت کو روانہ ہو رہا ہوں۔ اور سفر جیسے دو ڈھائی ہفتہ کے بجائے برسوں کا ہے! اور اسی ہجوم میں ایسے سادہ دل بزرگ بھی تھے جو یہ فرض درجۂ یقین میں کئے ہوئے تھے کہ میں گویا بہ طور گورنر جنرل بہادر کے سیاسی یا آئینی مشیر کے جا رہا ہوں! اور کم سے کم چھوٹے بڑے عہدہ داروں کی ترقی و تقرر کے قلمدان کی کنجی تو میرے ہاتھ میں ہے ہی! "دیکھیے میرے فلاں عزیز کا نام نہ بھول جایئے گا اچھی طرح نوٹ کر لیجئے فلاں محکمہ میں بیچارہ کی ترقی مدت سے رکی ہوئی ہے" اور "دیکھیے فلاں عزیز کا تقرر ضرور کرا دیجئے گا غریب کو اب تک جگہ نہیں مل سکی" غرض سفارشوں اور فرمائشوں کی ایک پوٹ کی پوٹ تھی کہ کامل اعتماد اور پوری سادگی کے ساتھ ایک دوش ناتواں پر لادی جا رہی تھی! ـــــ رخصتی کا منظر پر اثر ہوتا ہے اور قلب اگر حساس ہو تو پُر حسرت اور دردناک بھی سفر آخرت کے

منظر سے کتنا مشابہ! عزیزوں، دوستوں کا ہجوم ساتھ آتا ہے اور میت کو اسی طرح قبر کے سپرد کر کے چلا جاتا ہے!

گاڑی چلی اور دماغ کے تصور خانے میں پاکستان کے اگلے پچھلے نقشے پھرنے لگے ترجمان حقیقت اقبال نے کس شوق اور چاؤ کے ساتھ اس "اسلامی" مملکت کی تحریک دلوں میں قائم کرائی تھی۔ ہزار ہا مخلص جانبازوں نے کس درد مندی سے اس آواز پر لبیک کہی تھی۔ کیا کیا آرزوئیں تھیں اور کیسے کیسے منصوبے! اور اب اس شیریں و خوشگوار خواب کی تعبیر کیا نکل رہی ہے! اُمت نے اس کے پیچھے کیا کچھ کھویا، اس کے نام پر کیا کیا لٹایا، اور اب اسے حاصل کر کے کیا کیا پایا! نفع و نقصان کی میزان کیا رہی! سودا مہنگا پڑا یا سستا! ــــ شام ہوئی، رات کا اندھیرا چھایا، خیالات کی یہ رو جاری تھی۔ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے کہ پچھلی رات میں گاڑی یوپی کے حدود طے کر کے سرحد پنجاب میں داخل ہو گئی اور پھر صبح ہونے لگی!

یہ انبالہ پڑا جو کبھی شیخ التبلیغ میر نیرنگ کے دم سے گلزار تھا۔ اور وہ لدھیانہ ملا۔ یہ سرہند گزرا جسے ایک مجدد وقت کی آرام گاہ آج بھی "شریف" بنائے ہوئے ہے اور وہ راجپورہ نکلا۔ یہاں تک کہ دن کے اجالے میں جالندھر آ گیا۔ یہاں ابھی کل تک کتنے عالم و فاضل آباد تھے۔ اور یہاں کی کتنی مسجدوں کے مینار دن رات اللہ کی توحید کی گواہی پکار پکار کر دیتے رہتے تھے! ــــ دل پر مسرت و انبساط کے بجائے اب تمامتر حسرت و غم کے جذبات طاری تھے۔ لیجیے۔ اب جالندھر اور امرتسر کے درمیان کا علاقہ شروع ہو گیا اور آہ کچھ نہ پوچھیے۔ دماغ کے کیمرہ کے سامنے کیسی کیسی حسرت آلود، خون میں ڈوبی ہوئی تصویریں آ گئیں! کتنے معصوم بچوں اور بچیوں کا معصوم خون اس سرزمین میں جذب ہوا ہوگا!

کتنے مظلوم بوڑھوں اور بوڑھیوں کے لاشے اسی علاقے میں تڑپ کر سرد ہوئے ہوں گے!
کتنی عصمتیں یہاں دن دہاڑے بے دردی سے لٹی ہوں گی! اللہ کی زمین ان عصمت آبوں پر
تنگ ہوگئی ہوگی! وہ فریاد کر رہی ہوں گی اور کوئی ان کی چیخوں کا سننے والا نہ ہوگا! ظلم!
شقاوت، شیطنت کا کون سا کھیل ہے جو اس علاقے میں ہفتوں بلکہ مہینوں نہیں کھیلا جاچکا
ہے ۔۔۔ مسلمان جن صورتوں میں مظلوم رہے اُن پر آہ و فغاں تو بالکل قدرتی تھی
لیکن ساتھ ہی یہ عقلی تسکین بھی موجود تھی کہ شہادت و مظلومیت کے اجر بھی کیسے کیسے
بے حساب اور قابل رشک انھیں مل چکے ہوں گے لیکن قلب ان صورتوں کے تصور سے
کانپ گیا جہاں سبقت و اقدام کا داغ مسلمانوں کے چہرہ پر لگا نظر آیا۔ یہ داغ غیروں
کی نظر میں، خود اسلام کے روئے روشن پر لگا اور یہ تصور آتے ہی سر ندامت سے
جھک گیا۔ دس مسلمانوں کا مظلوم ہوکر اپنے رب کے حضور میں حاضر ہونا اس سے
کہیں بہتر ہے کہ ایک مسلمان بھی ظالم بن کر دنیا و آخرت میں رونما ہو!

۱۳

لاہور نمبر (۱) مُسافر نوازیاں

امرت سر اسٹیشن بات کی بات میں آگیا ـــ وہی امرتسر مرحوم جو کبھی مسلمانوں کا تھا جو ابھی کل تک اسلامیت کا مرکز تھا۔ مسجدوں اور دینی درسگاہوں کا شہر تھا کیسے کیسے عالم دین اور شیخ طریقت یہاں رہتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم اور مولانا مفتی محمد حسن سلمہ اللہ کو کوئی بھلانا چاہے بھی تو کیسے بھلا دے! خلافت کمیٹی والوں اور احرار کا تو گویا قلعہ تھا۔ کیسے کیسے اہل حق اسی خاک سے اُٹھے اور اسی میں ملے! حافظہ نے بچپن کا ایک ورق کھولا تو اس میں وکیل اور اس کے دوسرے مطبوعات کے نقش کیسے اُبھرے اُبھرے نظر آئے! غرض یہ کتنی خوشگوار اور روح پرور یادیں اس شہر سے وابستہ تھیں وہ اب صرف اس کے ماضی سے وابستہ ہو کر باقی رہ گئی ہیں! دم بھر میں یہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ سوادِ شہر جس وقت بھی ریل سے نظر آنا شروع ہوا، اسی لمحہ حسرتوں کا یہ باب بھی دماغ کے کتاب خانہ میں کھل گیا ـــ آخر صحو نے سکر کے دروازہ پر دستک دی۔ ہوش نے ربودگی کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا، حواس کی آنکھیں کھلیں۔ پلیٹ فارم پر گاڑی رک چکی تھی۔ ہندوستان کی میل ٹرین کا گویا ٹرمینس Terminus (آخری اسٹیشن) تھا۔ قلیوں سے کچھ بڑھ کر آوازیں سپاہیوں کی آنے لگیں۔ ہندوستان کے سکہ کی حکمرانی ختم ہوئی۔ دوسری مملکت کے سکہ کی عملداری شروع ہونے کو ہے۔ نوٹ، روپیہ، ریزگاری جو اور جتنی بھی چاہیے نقد انقد بدلوا لیجئے!

سفر کی کہانی نقشہ کی زبانی
مملکت افغانستان
کشمیر
مملکت پاکستان
مملکت ہندوستان

امرتسر سے لاہور کا فاصلہ ہی کیا ہے میل ٹرین کے لئے اتنی مسافت گھنٹوں کی نہیں منٹوں کے طے کرنے کی ہے لیکن تقسیم کے بعد ہم بدبختوں کے لئے کوئی معمولی سی سہولت بھی کب باقی رہنے پائی ہے۔ ہر چیز کا فیصلہ جب ضد اور نفسا نفسی ہی پر ٹھہرا تو باہمی سہولتوں کے لئے کسی گنجائش کا سوال ہی کہاں رہ گیا ہے؟ معیار عمل تو یہ پڑ گیا ہے کہ اختیار ہر وہ عمل کیجئے جس سے دوسرے فریق کو زک پہنچے۔ چاہے اپنا ہی نقصان اس سے کیوں نہ لازم آجائے! غیر کسمت کر تو بدشگونی ہو۔ خواہ اس کے لئے اپنی ہی ناک جڑ سے اُڑا دینا پڑے!

یہ تیس بتیس میل کا فاصلہ اب ایک لوکل ٹرین کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ (اور یہ لوکل ٹرین تو اب جاکر چلی ہے تقسیم کے سات سال بعد!) اور اس پر اشاک سُنا ہے کہ ایک دن ہندوستان کا چلتا ہے اور ایک دن پاکستان کا۔

خواہ مخواہ اور بالکل بلا ضرورت امرتسر پر گاڑی تبدیل کرنا پڑی۔ اور اس لوکل گاڑی نے تھوڑی ہی دیر میں اٹاری پہنچا دیا۔ یہ ہندوستان کا سرحدی اسٹیشن ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹا سا اسٹیشن جس کی اہمیت کی کل کائنات یہ کہ یہ سرحد کا اسٹیشن ہے۔ یہاں حکم ہے کہ چھوٹے بڑے سارے مسافر مع اپنے چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اُتریں اور کچھ دور چل کر اپنے پاسپورٹ دکھائیں۔ اپنے سامان کا جائزہ کرائیں اور پھر سے گاڑی میں سوار ہو جائیں!۔۔۔ حاجیوں کو ایک زمانہ میں جزیرہ کامران میں قرنطینہ کی شدید تکلیف وہ منزل سے گزرنا ہوتا تھا۔ بس اسی کا نمونہ۔

یہاں پہلا تجربہ آپ کو قلی راج کا ہوگا۔ پنجاب کے ہیکڑ اور اکھڑ قلی جو کچھ چاہیں گے آپ سے مطالبہ کریں گے اور وہی لیکر رہیں گے۔ آپ ان کے سامنے اپنے کو بے بس پائیں گے۔ داد فریاد کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ پولیس دیکھنے میں بہت سی کھڑی ملے گی

لیکن مدد آپ کو نہ پولیس سے ملے گی نہ اسٹیشن اسٹاف سے! عمارت اس "پکنگ" کیلئے کوئی چھوٹی سی بھی موجود نہیں۔ صرف دو شامیانے سے لگا دیئے ہیں۔ ایک میں پولیس کے کچھ افسر کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کے لئے اور دوسرے میں محکمۂ کسٹم کے افسر سامان کی جانچ کے لیے۔ مسافروں کی راحت و آسائش کے نام کا صفر ہی صفر ہے اور اس میں مسافر چاہے فرسٹ ہی کلاس کے کیوں نہ ہوں! کوئی چارہ بجز اس کے نہیں کہ یا تو ہجوم میں گھس کر دھکے کھایئے اور یا پھر صبر کے ساتھ اپنے سامان ہی پر بیٹھے ہوئے اپنی باری کا انتظار کیجیے۔ جنھیں اپنی خود داری عزیز ہے، وہ اس حقلپش اور ذلت کے تجربے کے بعد اپنے کو کوستے اور اپنے ہی اوپر جھنجھلاتے ہیں کہ سفر ناحق ہی اختیار کیا۔ وہ تو کہئے کہ بس نہیں چلتا اور واپسی کی کوئی گاڑی سامنے موجود ہوتی نہیں، ورنہ عجب نہیں کہ کچھ لوگ تو آدھا منزل پر سفر تمام کرکے ہندوستان واپس ہی چلے آئیں! ـــــ شدید انتظار و انقباض کے عالم میں گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مدت بھی چار پانچ گھنٹہ سے کم معلوم نہیں ہوئی۔

خدا خدا کرکے گاڑی پھر سے چلی اور منٹوں کے اندر پاکستان کا پہلا سرحدی اسٹیشن جلّو آگیا۔ اور پتا ہی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت اور کہاں ہندوستان کی حد ختم ہوئی اور پاکستان کی سرزمین شروع ہوگئی! ـــــ اور یہاں بھی اپنی ہولناکی اور ابتر انگیزی میں اٹاری سے کچھ کم نہ تھا۔ اور پاکستان آخر کسی چیز میں ہندوستان سے پیچھے کیوں رہنے لگا! بقول شخصے،

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

کتاب ایک ہی۔ اس کا ایک ہندوستانی اڈیشن اور دوسرا پاکستانی۔ عام مسافروں بیچاروں پر یہاں بھی سب کچھ وہی گزر رہا جو کچھ دیر پہلے اٹاری میں گزر چکا تھا۔ البتہ میرا اپنی

ذاتِ خاص سے یہاں محفوظ اور مستثنیٰ رہا۔ یہاں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کسٹم اتفاق سے میری کتابوں سے واقف نکلے اور ایک عزیز نے خط لکھ کر انھیں واقف تر کر دیا تھا۔ مجھے اتار کر اپنے کمرہ میں لے گئے اور چائے وغیرہ سے بڑی خاطریں کرتے رہے۔ یہیں بیٹھا ہوا تھا کہ لاہور سے ایک صاحب نے فون پر دریافت کیا کہ دریابادی اسی ٹرین سے آ رہے ہیں؟ یہاں سے جواب اثبات میں گیا اور یہ بھی کہ عین اس وقت اسی کمرہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دریافت حال کن صاحب نے کیا تھا اور ان سے بھی واقف ہو جائیے۔ عبدالوحید خاں بی۔ اے ال ال بی (مصنف "مسلمان اور جنگ آزادی") میرٹھی سے لکھنوی ہوئے اور اب ہجرت سے لاہوری ہیں۔ لکھنؤ میں پُرجوش لیگی تھے۔ اور لاہور میں بھی ام۔ ال۔ اے رہ چکے ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی میں ڈرا کہ یہ آدمی (بے ڈھب قسم کے ہیں۔ جلسہ، جلوس، نعروں کے عادی۔ ان سے کچھ بعید نہیں جو میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی سوانگ کھڑا کر دیں۔ بیچارہ اپنے خلوص و محبت کے اظہار کا طریقہ یہی سمجھتے ہیں۔ بغیر اس کا خیال کیے کہ اس سے خود میرے اوپر کیا گزر رہی ہے گی اور انھیں خبر بھی کس نے کر دی؟ میں نے تو مخصوص دو ہی تین شخصوں کو اطلاع دی تھی اور ان سے بھی تاکید کر دی تھی کہ اعلان عام ہرگز نہ ہونے پائے۔ یہ تو بہت بعد کو معلوم ہوا کہ لاہور کے مقبول و معروف روزنامہ "نوائے وقت" میں آمد کی خبر چھپ گئی تھی۔

دم کے دم میں لاہور شہر کے دیباچے شروع ہو گئے۔ دور دور کی عام عمارتیں کارخانے اور مسجدیں، ریلوے ورکشاپ اور ریل والوں کے کوارٹر، مغلپورہ میں انجنوں اور ڈبوں کی ریل پیل۔ خاص لاہور جنکشن کا لق و دق یارڈ۔ پہلی بار ریل کے ڈبوں پر اردو حروف میں پاکستان ریلوے کا نظارہ! ادھر خیال کی نظروں کے سامنے لاہور کی تاریخی اہمیت، قدیم اسلامیت، ملی مرکزیت، ہر قدیم و جدید ملی تحریک میں اس کا پیش پیش ہونا۔ تحریک علیگڑھ ہو یا تحریک

خلافت سب میں بڑی حد تک اس کی امامت یہاں کی شہرۂ آفاق صحافت، اردو زبان کی خدمات میں اس کی سبقت، یہاں کے اہل علم واہل قلم، پیسہ اخبار مرحوم، زمیندار، اقبال، ظفر علی خاں، خواجہ کمال الدین، محمد علی، عبداللہ یوسف علی اور نو مسلم شیخ اسد ویس، شاہی مسجد و مزار شیخ علی ہجویری، مہر و سالک اور خدا معلوم کتنے اور قدیم نقش حافظہ کی لوح پر ابھر آئے۔ یہی یاد پڑ گیا کہ ایک مرتبہ اور، (۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں) اس شہر میں آنا ہوا تھا۔ پرنسپل برکت علی صاحب کے ہاں دعوت کی میز پر مولانا مودودی، مولانا داؤد غزنوی اور خان بہادر محمد حسین مرحوم (پریس برانچ والے) وغیرہم کا اجتماع تھا۔ جنگ یورپ (دوم) زور و شور سے جاری تھی اور مولانا صاحب اسی زور و قوت کے ساتھ برطانیہ کی شکست اور جرمنی کی فتح کے دعوے کر رہے تھے ـــــ آہ انسان کی غلط اندیشیاں اور بشری ظن و تخمین کی گمراہیاں!

پلیٹ فارم آگیا۔ اور متعدد جانے پہچانے ہوئے۔ مانوس و مالوف چہرے محبت کے تبسم کے ساتھ پیشوائی کو آگے بڑھے، یہ عشرت رحمانی ہیں۔ وہ شوکت تھانوی ہیں اور یہ وہی عبدالوحید خاں ہیں۔ اور متعدد اور علاوہ میرے میزبان اور ان کے عزیزوں کے، اور کچھ دو صاحب اور بڑھے۔ ایک معلوم ہوا کہ حکومت پنجاب کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں اور دوسرے ان کے اسسٹنٹ۔ اس وقت سے میں سرکاری مہمان تھا۔ ان حضرات نے کہا کہ "آپ جس ہوٹل کو پسند فرمائیں وہاں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا جائے اور ایک موٹر آپ کی سواری کے لئے ہر وقت موجود رہے گی۔" شکریہ کے ساتھ جواب میں عرض کیا گیا کہ اپنے کو راحت سب سے زیادہ اپنے عزیز مجبر ڈاکٹر حاجی خلیل الرحمٰن کے ہاں ملے گی۔ اس لئے ہوٹل وغیرہ سے تو معافی چاہتا

۴

لاہور نمبر (۲) مشاہدات و زیارات

لاہور جیسے "غدار"[1] شہر کا تو چپہ چپہ میرے لئے زیارت گاہ کے حکم میں داخل تھا۔ یہاں تین دن کیا معنی تین مہینے بھی مشکل ہی سے کافی ہوتے لیکن پروگرام میں قیام کی گنجائش کُل ساڑھے تین دن ہی کی نکلتی تھی اور پھر قیام بھی شہر سے میلوں دور چھاؤنی کے علاقہ میں تھا۔ اتنے ہی وقت میں کھینچ تان کر سب سے ملنا جلنا۔ سب کہیں آنا جانا تھا۔ اپنے مستقل سفری سکریٹری تو ساتھ تھے ہی۔ لاہور کی حد تک مقامی سکریٹری کے فرائض مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی کے سپرد کر دیئے۔ یہ خیر آبادی ثم پاکستانی سیرت محمد علیؒ کے مصنف میرے لئے بہت سے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ کراچی سے ماہنامہ ریاض نکالتے تھے۔ اب لاہور آ گئے ہیں۔ روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر ہیں اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ایک خاص کارکن ان دونوں کی مدد سے مشکل بڑی حد تک آسان ہو گئی اور پھر بڑی بات یہ کہ سرکاری موٹر چوبیسوں گھنٹہ کے لئے موجود ــــ سب سے پہلے آنے والوں میں خود ہی جعفری اور مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی رہے۔ السابقون الاوّلون انھیں لوگوں کو ہونا بھی تھا۔ جعفری کو تو ابھی آپ پہچان چکے۔ اب شاہ جعفر ندوی سے بھی متعارف ہو جائیے۔ اپنے دور کے مشہور و معروف واعظ شیوا بیان، بلبل ہزار داستان مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے خلف اصغر ہیں۔ پیدائشی پیرزادے اور "مشائخ" پھر ندوی

(۱) "غدار" کا استعمال اس معنی میں اب متروک سا ہو گیا ہے۔ بہت بڑے شہر کو غدار کہا جاتا تھا۔

ہوئے اب ندامت سے بھی بہت آگے ہیں لیکن پختہ مومن بحمداللہ ہر دور میں رہے۔ اب بھی ہیں۔۔ خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں اور کتابوں پر کتابیں لکھتے جا رہے ہیں بعض ان میں سے بڑی اہم اور معرکۃ الآرا ہیں۔ گو ایسا چمن یہاں کہاں جس میں پھول ہی پھول ہوں۔ کانٹے نہ ہوں۔

حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد سے بڑی تمنا تھی کہ ان کا کوئی صحیح اور سچا جانشین دیکھنے میں آئے۔ آنکھیں مدت سے اسی کے لئے ترسی ہوئی تھیں۔ ذکر متعدد ثقہ لوگوں سے سننے میں آیا تھا کہ اس صفت کے ایک بزرگ لاہور میں ہیں، مولانا محمد حسن امرتسری ثم لاہوری، جو مسجد نیلا گنبد کے متصل مدرسہ اشرفیہ میں رہتے ہیں اور اپنے مرشد کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ جذبۂ شوق سب سے پہلے انھیں کی خدمت میں لے گیا۔ کہنا چاہیے کہ قیام لاہور کے اہم ترین مقصدوں میں ایک مقصد یہی تھا۔ بعد عصر حاضری ہوئی اور دیر تک حکمت و معرفت کے کلمات اور اچھی اچھی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ بزرگی صورت سے ظاہر اور تواضع و حسن خلاق تو شاید ان کا حصہ ہے۔ بار بار اٹھنا چاہا، لیکن مولانا کی شفقت نے اٹھنے نہ دیا اور دادی خاطر بھی جائے اور ناشتہ سے خوب رہی یہیں حضرت تھانوی کے ایک اور خلیفہ جلیل حافظ جلیل احمد خاں علیگڑھی ثم تھانوی ثم لاہوری کی بھی زیارت نصیب ہوگئی۔ اپنے حضرت کے عاشقوں میں تھے اور انھیں کے عشق میں اپنا وطن علی گڑھ اور وہاں کی بڑی جائداد چھوڑ، تھانہ بھون میں بس گئے تھے، اب سالہا سال سے یہیں ہیں۔ دیکھ کر پلٹ گئے۔ تواضع و شفقت دونوں میں اب اور ترقی ہی ہے۔ یہیں در وادہ ضمناً اور محض اتفاقاً بطور نعمت غیر مترقبہ دیوبند کے فاضل مہتمم مولانا محمد طیب صاحب کی دولت دیدار بھی حاصل ہوگئی، چہرہ کی نورانیت اور بشرہ کی شگفتگی ماشاء اللہ لطف قابل رشک ہے۔ عشاء کے وقت گھر واپس پہنچا تو لاہور کے بسا رئیس اور زود نویس اور خوب نویس اہل قلم میاں محمد اسلم کو منتظر پایا۔

میاں صاحب کے سُنے لکھائے "کم ہی ہوں گے اور وہ ہر قسم کے تعارف سے بالاتر ہیں انھیں کے ہمراہ دہلی کے اشرف صبوحی بھی تھے۔ گمنام سے بھی اور کچھ گوشہ نشین سے بھی۔ یہاں بھی بیٹھے تو دبے دبائے۔ سمٹے سمٹائے۔ گویا بات کرنا نہیں جانتے یا زبان کھولتے شرماتے ہیں۔ کیا کیجئے کہ بیچارے پبلسٹی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، اپنی مشرقی وضعداری اور دہلوی شرافت کو لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا بھی آگے بڑھنا جانتے تو آج کتنوں کا چراغ ان کے سامنے گل ہو گیا ہوتا۔ اب بھی جو کچھ لکھ دیا ہے دہلی کی ٹکسالی زبان و انشاء کے معیار سے آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

لاہور ۔۳ را پریل (۱۹۵۰ء) ہندوستان سے پاسپورٹ پر آئے ہوئے ہر فرد کی حیثیت مجرم کی اگر نہیں تو نیم مجرم کی تو ہوتی ہی ہے۔ وارد ہوتے ہی پولیس سٹیشن جا کر حاضری لکھانا ضروری ہے۔ مہمان سرکاری ہو جب بھی اس ضابطہ سے مفر نہیں، اتنی ہی رعایت بہت ہے کہ بجائے کل کے آج صبح یہ کام ہوا اور بجائے اصالۃً حاضری کے سکریٹری کے ذریعہ ہو گیا۔ شاہی مسجد کی زیارت اور مزار اقبال پر حاضری پروگرام کے ضروری اجزاء تھے۔ بحمداللہ موقع مل گیا۔ مزار اقبال کے دوسری جانب مرحوم سر سکندر حیات خاں کی تربت بھی دیکھی اور دل اس سے بھی خاصہ متاثر رہا۔ راستہ میں شہید گنج کا مشہور و معروف گردوارہ پڑا اور حافظہ کے سامنے مسجد شہید گنج ایجی ٹیشن کی ساری تاریخ پھر گئی۔ وہ مسلمانوں کا مجاہدانہ جوش و خروش، وہ سکھوں سے عدالتی اور میدانی مقابلہ، وہ احرار کے سُرخ پوشوں اور ظفر علی خاں کے نیلی پوشوں کی آویزش، ہفتوں نہیں مہینوں اس چپقلش کا تسلسل۔ یہ ساری باتیں گویا ابھی کل ہی ہوئی تھیں! آج لاہور شہر مسلمانوں کا اپنا ہے۔ آج تو یہ "مسجد" بلا تامل

اور بغیر کسی دغدغہ کے مسجد ہی ہو سکتی تھی لیکن نہیں ــــ آنکھوں نے منظر اس کے برعکس پایا۔ مسجد نہیں یہ بدستور گردوارہ ہے۔ اس پر پولیس کا پہرہ ہے۔ اور پہرا بھی کس کے خلاف؟ مانئے یا نہ مانئے خود مسلمانوں کے خلاف! یعنی پولیس اسی نگرانی کے لئے ہے کہ کوئی مسلمان اس قطعۂ زمین پر نماز پڑھنا کیا معنی، یہاں قدم نہ رکھنے پائے! بلکہ دیر تک قریب کھڑا بھی نہ رہنے پائے! ــــ یا اللہ! یہ وہی پاکستانی مسلمان ہیں جن کے جنونِ تعصب کا ایک عالم میں ڈھنڈورا پٹا ہوا ــــ گردوارہ بند رہتا ہے اور صرف سکھوں ہی کی آمد پر کھل سکتا ہے ذہن بیساختہ اپنے یو۔پی کی بابری مسجد (اجودھیا) کی طرف منتقل ہو گیا۔ عدالت دیوانی جو کچھ بھی فیصلہ کرے اس سے یہاں بحث نہیں۔ بحث اس سے ہے کہ کیا ہماری یو۔پی کی سیکولر حکومت اتنا نہیں کر سکتی تھی کہ تا فیصلہ عدالت اسے منتقل کر کے اسی طرح پولیس کا پہرا لگا دے اور جس طرح اسے مسجد باقی نہیں رکھا ہو ہندو مندر بن جانے سے بھی اسنے روکے رہنے؟

لاہور کی رونق کا کیا کہنا۔ ہر بڑے شہر کی طرح شہری و تمدنی چہل پہل سے لبریز۔ سیر و تفریح گلگشت کھیل تماشے کے موقع خصوصاً چھاؤنی اور سول لائنس کے حصوں میں قدم قدم پر موجود۔ مال روڈ (ٹھنڈی سڑک) سے بھی بار بار گزرنا ہوا۔ لیکن بے حیائی کے وہ منظر کہیں بھی دیکھنے میں نہ آئے جن کے لئے لاہور کی بدنامی اچھے اچھے ثقہ حلقوں میں مدت سے چلی آرہی ہے عورتیں یوں بھی سربازار چلتی پھرتی تانگوں اور موٹروں پر دوڑتی، سائیکلوں پر اڑتی زیادہ نظر نہ آئیں جو تھیں بھی وہ عموماً برقع پوش۔ کھلے ہوئے چہروں کے ساتھ کم ہی تھیں اور بے حجابی و بیحیائی کے ساتھ تو اور بھی کم جتنی تھیں۔ ایک اسلامی مملکت میں بیشک اتنی بھی نہ ہونا چاہیئے تھیں یہاں سوال "چاہیئے" کا نہیں۔ واقعہ کا ہے۔ واقعہ کے لحاظ سے عرض ہے کہ جتنے چرچے سُنے

تھے۔ اس کے مقابلہ میں مشاہدہ کی شہادت تو بہت ہی کم کی ہے ۔۔۔۔ مسجدوں میں بجز فجر کے اور مختلف اوقات کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کوئی مسجد ویران نہ ملی سب جگہ نمازی بھی خاصی تعداد میں نکلے۔ یہاں تک کہ مقبرہ جہانگیر میں جو مسجد آبادی سے بالکل الگ ہے۔ وہ بھی مغرب کے وقت نمازیوں سے یکسر خالی نہ تھی۔ بہرحال نمازیوں کی یہ تعداد اور مسجدوں کی یہ معموری بحمداللہ ایسی نہ معلوم ہوئی جو کسی مسلم مملکت کے بڑے شہر کے لئے باعث ننگ ورسوائی ہو۔
تیسرا مشاہدہ اسی سیاق کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ سڑکوں کی تختیوں اور عمارتوں کے نام جوں کے توں ہیں۔ یہ نہیں ہوا کہ آزادی کے جوش میں آکر تزلہ غیر مسلم ناموں پر گرا ہو۔ جو دھنی رام اسٹریٹ تھی وہ آج بھی دھنی رام اسٹریٹ ہی ہے۔ اسے کوچہ باقی باللہ نہیں بنا دیا گیا۔ جو سر گنگا رام ہاسپٹل تھا وہ آج بھی بدستور سر گنگا رام ہاسپٹل ہی ہے یہ نہیں ہوا کہ اس کا نام دارالشفا جناح رکھ دیا گیا ہو! یہ بات بہ ظاہر معمولی سی لیکن قوموں کے ذہنی توازن اور ملتوں کے ظرف کا اندازہ انھیں باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔

مقبرۂ جہانگیر کا ذکر ابھی پانچ سطریں اوپر آیا ہے۔ اُنڑ کے لئے یہ مرقع عبرت بھی کچھ کم نہ تھا۔ آج یہاں فاتحہ پڑھنے کے متنفس آتے ہیں۔ سیر و تماشہ کے لئے جتنا مجمع بھی ہو جاتا ہو۔ لیکن چشم تصور کے سامنے ذرا وہ وقت لائیے جب آج سے چار صدی قبل اس شہنشاہِ ہند کا انتقال ہوا ہوگا۔ "ظلِّ سبحانی" کے اُٹھ جانے کی خبر سے رعایا کے دل پر کیا گزر کر رہی ہوگی۔ کیسا تلاطم مچ گیا ہوگا۔ کس غضب کی ہل چل شہر بھر میں پڑ گئی ہوگی! وہ دن کیسا کٹا ہوگا۔ بادشاہ کی تجہیز و تکفین و تدفین کا منظر کتنا مؤثر رہا ہوگا۔ جنازہ کا جلوس کس شان سے اُٹھا ہوگا۔ نمازِ جنازہ کس نے پڑھائی ہوگی۔ جس جگہ آج مقبرہ ہے اس وقت یہاں کون رہتا ہوگا۔ کس طرح عمارت مقبرہ اور باغ کے لئے یہ زمین حاصل کی گئی ہوگی۔ جن لوگوں کے دلوں میں بادشاہ پرستی

بطور ایک دینی عقیدہ کے رچی ہوئی تھی ان سے بادشاہ کے لیے قبر کیوں کر کھدی ہوگی۔ بادشاہ کے لاشہ کو قبر میں کیوں کر اُتارا گیا ہوگا۔ اس روز کس غضب کا سناٹا محسوس ہوا ہوگا۔ سوگ کیسا زبردست منایا گیا ہوگا۔ اور آج ان چیزوں میں کسی کی کوئی اہمیت باقی ہے؟ دماغ میں اسی قسم کے بیسیوں سوالات چکر کھاتے رہے اور ہر لمحہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کے جاہ و حشم کی بے حقیقتی کا درس ملتا رہا۔

(۵)

لاہور نمبر (۳) خاطرداریاں

پارٹیوں اور دعوتوں کا سلسلہ عبدالوحید خاں صاحب کے ہاں سے شروع ہوا انکی پارٹی اچھی خاصی پُرتکلف تھی مہمانوں کی تعداد بھی میرے اندازے سے زائد اور کھانے کا طریق تو اپنے مذاق کے بالکل ہی برخلاف یعنی کھڑے کھڑے کھانا اور پینا۔ جس سے نہ کوئی لذت بڑھ جاتی ہے۔ نہ کوئی سہولت کھانے پینے والوں کو حاصل ہوتی ہے اور نہ کوئی طبی ہی نفع اس میں ہے۔ خیر میں تو احتجاج کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور سالک صاحب وغیرہ دو ایک اور مہمانوں نے بھی میرا ساتھ دیا باقی اور حضرات اس خواہ مخواہ "صاحبیت" اور گناہ بے لذت قسم کے تشبہ بالنصاریٰ پر کچھ مطمئن ہی سے نظر آئے۔ یہ جدید ترین فیشن ہر اعتبار سے مکروہ اور تکلیف دہ ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر میزبان صاحب کے خلوص و محبت کے اعتراف کے ساتھ ان کی دل شکنی کا خطرہ لینے کے باوجود اس روداد سفر میں اس کا ذکر کیئے دیتا ہوں۔ یہیں تفضلی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی اور مل کر جی خوش ہوا۔ ہندوستان کے ایک ممتاز صاحب علم آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ اب پاکستان میں غالباً وزارت کشمیر کے سکرٹری ہیں۔ صاحب علم ہیں۔ صاحب ذوق ہیں اور بڑی بات یہ کہ صاحب فہم بھی ہیں اور سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں میں مرتبۂ امتیاز رکھتے ہیں —— یہیں اور بھی متعدد اہم ہستیوں سے نیاز حاصل ہوا اور بعض سے تجدید نیاز ہوئی۔ دو صاحب اور ملے۔ غالباً سرکاری عہدہ دار اور

یہاں کی لٹریری لیگ کے کارکن، ان کی فرمائش قدرۃً یہ ہوئی کہ ان کی انجمن کے ارکان سے ملا جائے، جواب میں دست بستہ معذرت کی گئی کہ کسی قسم کے پبلک اجتماع کی گنجائش اس پروگرام میں نہیں ۔ الحاح کے بعد بھی عذر قبول نہ ہوا۔ اور غالباً اس اعتذار کو بھی تکلف ہی پر محمول کیا گیا اور اصرار برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بعد کو کسی غلط فہمی کی بنا پر ایک انگریزی نامہ میں یہ اطلاع بھی شائع ہوگئی کہ ٹاؤن ہال میں فلاں دن فلاں وقت میں تقریر کروں گا! ظاہر ہے کہ جب بڑی تعداد میں ارکان ہی سے ملنے میں تامل تھا تو اس پبلک میٹنگ میں شرکت کی کیا صورت ممکن تھی! عین وقت کے وقت ٹیلیفون پر معذرت کرنا چاہی۔ ٹاؤن ہال سے سلسلہ ہی نہ ملا جعفری صاحب اس کے گواہ ہیں بلکہ وہی تو میری طرف سے فون کر رہے تھے۔ لوگ جمع ہوئے ہوں گے اور بڑی ناگواری کے بعد ہی رخصت ہوئے ہوں گے لیکن اس قصور کی ذمہ داری اس عاصی پر بہت ہی کم ہے ۔۔۔ مخلصین کے ہاتھوں اس قسم کا تجربہ یہ پہلا نہیں ہوا۔ بار ہا عرض کر چکا ہوں کہ میں پبلک لیڈر کسی درجہ کا بھی نہیں۔ اور اگر کبھی تھوڑا سا تھا بھی تو اس دور کو ختم ہوئے سالہا سال ہو چکے ایک کسی پبلک اجتماع میں محض شرکت ہی سے طبیعت پر بار ہوتا ہے چہ جائیکہ اس میں تقریر یا صدارت وغیرہ۔ لیکن بار بار کے اس انکار و اعتذار کے باوجود بھی محبین و مخلصین کا ایک بڑا گروہ ہے جو اپنی اس فرمائش کی تعمیل پر اصرار برابر جاری رکھے ہوئے ہے۔ افسوس!

آشکارم دید و پنہانم نہ دید!

اور نوبت آخر میں بار ہا فریقین کی ناگواری کی آچکی ہے!

دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ وسیع بھی تھا اور طویل بھی۔ اب سب یاد بھی کسے لیکن دو چار تو ایسی ہیں جو کسی حال میں بھی بھولنے والی نہیں۔ ان میں سے ایک شورش صاحب

"چٹان" والوں کے ہاں تھی۔ نام مدت سے کان میں پڑا ہوا تھا۔ چٹان کی زیارت بھی ہر ہفتہ ہوتی رہتی تھی۔ ملے تو سراپا باغ نکلے۔ چٹان کی خشکی کرختگی اور صلابت کے بجائے مہر و وفا کے پتلے۔ تقریر و خطابت کا رنگ تحریر تک میں غالب ہوتا ہے تو پھر گفتگو تو اس رنگ کی ہونا ہی تھی۔ پرچہ اور گفتگو دونوں سے سو فیصدی قسم کے مسلمان نظر آتے ہیں۔ لیکن کھانے کی میز پر پورے نواب یا سرمایہ دار یا جاگیردار۔ ابھی جوانی ہی کی آخری منزلوں میں ہیں لیکن اتنے ہی سن میں دس سال سے اوپر کی مدت جیل میں کاٹے ہوئے! خدا نہ کرے کہ اب کبھی جیل جانے کی نوبت آئے اور نہ وہ خود کبھی اپنے کو جیل کے لئے پیش کریں۔ ولایتی حکومت میں جیل جانے کے معنی کچھ اور تھے اور اب اپنی حکومت میں کچھ اور ہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ہونا جس طرح ایک رنگ عبادت کا ہے اسی طرح رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کی شان بھی امتثالِ امر اور تکمیل عبدیت ہی کی ہے ـــــ یہیں ملاقات لاہور کے متعدد مشاہیر سالک صاحب، راجہ حسن اختر وغیرہ سے رہی اور یہیں پہلی بار زیارت حمید نظامی ایم اے ایڈیٹر روز نامہ "نوائے وقت" کی ہوئی اُن کے پرچہ کی اہمیت تو ہمیشہ سے دل نشین تھی طبیعت ان کی شخصیت سے بھی متاثر ہوئی۔ پُر وقار سنجیدہ ہر قسم کے سفلہ پن سے دور، یہ صفات معمولی نہیں۔ موجودہ زمانے میں ایک صحافی کے لئے غیر معمولی ہیں۔ خیال تھا کہ مجلس پر وہی چھائے ہوئے ہوں گے اور ایک ایک سے داستانِ "در وصف خود می گوید" بیان ہو رہی ہوگی۔ اس کے برعکس وہ شرمیلے، متین، خاموش، خود دار نکلے۔

دوسرا اسیرانہ بلکہ کہنا چاہیئے کہ شاہانہ ڈنر صاحب زمیندار اختر علی خاں صاحب کے ہاں ہوا۔ آخر یہ بلند اختر صاحبزادہ کس باپ کے ہیں۔ وہی جاہ اور وہی اولوالعزمی، پُرتکلف مہمان نوازی میں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین اور خلف الصدق۔ دفتر زمیندار کی بھی پُرشکوہ عمارت گھوم پھر کر ابھی ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کھانوں کے تعدد کے ساتھ ساتھ مہمان بھی کثرت سے تھے۔

اور میزبان فرطِ اخلاق سے بچھے جاتے تھے۔ یہیں ملاقات وقار انبالوی صاحب ایڈیٹر روزنامہ احسان سے اور محمود نظامی صاحب ایڈیٹر قندیل سے ہوئی جگر صاحب اتفاق سے اس وقت لاہور ہی میں مقیم تھے ان سے بھی نیاز حاصل رہا۔ حمید نظامی، شوکت تھانوی، سالک، شورش سب ہی اس محفل کو رونق بخشے ہوئے تھے۔

تیسرا پرتکلف ظہرانہ مشہور اسلامی ناول نگار میاں محمد اسلم صاحب کے ہاں تھا۔ اسے سادہ صرف اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ مہمانوں کی بھرمار نہ تھی۔ گنے چنے لوگ تھے۔ اشرف صبوحی۔ جعفری ندوی۔ اور میاں صاحب کے ناشر بدر الاسلام فروغی۔ باقی جہاں تک انواع و اقسام کے کھانوں کا تعلق ہے میاں صاحب کے عمل اور قول میں تضاد ہی نظر آیا۔ کہاں تعلیم اسلامی سادگی کی اور کہاں عمل اس کے برعکس تکلف اور رفاہی تعیش کا! لاہور میں سمجھتا تھا کہ تکلفات سے بری اور سادگی کا شہر ہوگا لیکن دعوتوں کے مسلسل تجربہ نے بتا دیا کہ جہاں تک کھانا کھلانے کی شوقینیوں اور رفاہی اسراف کا تعلق ہے لاہور کا قدم ذرا بھی لکھنؤ سے پیچھے نہیں اور کام و دہن کے چٹخاروں کے لحاظ سے اودھ اور پنجاب، ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان سب ایک ہی سطح پر ہیں۔

دعوتوں اور ضیافتوں کا ذکر ناتمام رہ جائے گا۔ اگر اس واحد دعوت کا تذکرہ دلی شکر گزاری کے اضافہ کے ساتھ نہ کیا جائے جو عین میرے مذاق کی تھی، یہ دعوت کرنے والے شوکت تھانوی تھے۔ اس میں یہی نہیں کہ کھانوں کے اسراف بیجا سے پرہیز کیا گیا تھا یعنی کھانوں میں گو تعداد تھا لیکن تعدد اس بلا کا نہ تھا کہ میز کی میز بھر جائے اور دل کو حسرت ہی رہے کہ کوئی ایک کھانا بھی تو سیر ہو کر نہ کھایا جا سکا اور پھر مہمانوں کی تعداد محدود در محدود۔ صرف دو صاحب باہر کے جن سے گفتگو ہر قسم کی بہ اطمینان کی جا سکی ـــــــ شوکت تھانوی لاکھ زندہ دلی بذلہ سنج

در منسوز سہی پھر آخر تھانوی ہیں۔

مخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

مہمان کے مذاق کی یہ رعایت خاص فیض حضرت تھانوی کا ہے۔ کاش ان کی مثال دوسروں کے لئے باعث تقلید ہو۔ مہر صاحب کے ہاں کا عصرانہ بھی خاموشی دیکسوئی کے لحاظ سے قابل داد تھا اگر کھانوں کے تعدد و تنوع کے اعتبار سے ہرگز نہیں۔ جعفری ندوی کے ہاں کا صبح کا ناشتہ اور اکبر مرزا ایم اسے عدیا بادی کے ہاں کا سہ پہر کا ناشتہ کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں کہ یہ دونوں بالکل خانگی ہی چیزیں تھیں۔ بڑے پرانے جامعی اور بڑے مخلص "اقبالی" سید نذیر نیازی کا سے ملاقات اکبر مرزا ہی کے ہاں سالہا سال کے بعد ہوئی

وہ تو کہئے اپنی قیام گاہ دانٹگومری روڈ۔ کوٹھی سیر صدیقی شہر سے کئی میل دور چھاؤنی کے علاقہ کے بھی ایک کونے میں جا پڑی تھی۔ ورنہ خدا جانے کتنی جگہ اور آنا جانا رہتا محبت کرنے والوں کی آمد کا تو تانتا ہی بندھا رہتا شہر کی جن شخصیتوں سے ملنا ملانا تھا۔ ان میں سے اکثر سے نیاز تو انھیں دعوتوں ضیافتوں کے سلسلہ میں حاصل ہو گیا، کچھ مستثنیات۔ انکے علاوہ بھی قابل ذکر رہی جاتی ہیں۔

دلی کے خواجہ محمد شفیع صاحب اسلوب بدیع۔ اس وقت دلی کی ٹکسالی زبان کے امام اور اقلیم انشاء کے فرمانروا ہیں۔ عجب اتفاق کہ جب تک ہندوستان میں رہے کبھی ملاقات کی نوبت ہی نہ آئی۔ اب مدت ہوئی ہجرت کر کے لاہور آ گئے ہیں (ہجرت کا لفظ ان کے لئے بالقصد استعمال ہوا۔ ان کے صبر و تحمل کے وہ وہ امتحانات سننے میں آئے جو صرف سچے مہاجروں ہی کے نصیب میں آتے ہیں۔ ع دیئے داغ نے امتحاں کیسے کیسے) اور

ٹمپل روڈ پران کا مسکن، حق ہے کہ بجائے خود ایک زیارت گاہ بن جائے۔ ملے اور دونوں ملاقاتوں میں اس شان تواضع وانکسار سے ملے کہ جیسے میں مخدوم ہوں اور وہ خادم میں معلم ہوں وہ متعلم!"

تواضع زگردن فرازاں نکوست

اس مصرعہ کا محل اب سمجھ میں آیا۔ حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے "غدار" شہر میں اتنے بیکار ہیں۔ اور ان کی خدمات سے استفادہ نہ کوئی سرکاری محکمہ کر رہا ہے نہ کوئی غیر سرکاری ادارہ۔ عجب نہیں کہ اس صورت حال کی ذمہ داری خود انھیں کی بے پناہ خودداری پر ہو۔ تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس میں نقصان ان کا نہیں اردو زبان، اردو لغت، اردو ادب و انشا ہی کا ہے۔

سید ہاشمی فریدآبادی سے اُردو کے پڑھے لکھوں کے طبقہ میں کون ناواقف ہوگا۔ اپنے بھی بڑے قدیم مخلص و کرم فرما ہیں۔ شہرت بہ حیثیت مؤرخ اور تاریخی کتابوں کے مصنف و مترجم کے ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مؤرخ سے کہیں بڑھ کر ادیب وانشا پرداز ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے رُوح رواں تھے اور بابائے اردو کے دست راست۔ اب معلوم ہوا کہ لاہور میں ہیں اور علیل۔ مکان ماڈل ٹاؤن میں بڑی ہی تلاش کے بعد ملا۔ ملے تو ماشاءاللہ اب تندرست نکلے۔ شگفتگی اور دینداری کا اتنا خوشگوار امتزاج دیکھنے میں کم ہی آیا ہے۔ اب کسی سرکاری ادارہ کی طرف سے تاریخ لاہور مرتب کر رہے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر چیز پڑھنے کے قابل ہوتی ہے۔

ایڈوکیٹ جنرل پاکستان فیاض علی صاحب سے توقع تو کراچی پہنچ کر ملنے کی تھی قسمت غیر مترقبہ کر دہ یہیں لاہور میں مل گئے۔ اخلاص و محبت کے پتلے ہمیشہ سے تھے اور اب اپنے

پیشرو نسیم صاحب (مرحوم) کے جانشین ان کی اور اخلاقی خوبیوں اور بزرگیوں میں بھی ہوتے جاتے ہیں۔ اس وقت زبان خلق میں مطعون اس جرم میں ہو رہے ہیں کہ دوسری شادی کر لی ہے۔ اس خواہ مخواہ کی بدگوئی سے یہ پھر بھی نفع ہی میں ہیں کہ اس سے ان کے گناہ دھلتے جاتے ہیں۔

غازی عبدالرحمٰن امرتسری کا اب تو لوگ نام ہی بھول گئے۔ کیسے بتایا جائے اور کیسے یاد دلایا جائے کہ آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل پنجاب بلکہ آل انڈیا مسلم سیاست میں انکی کتنی اہمیت تھی۔ خلافت کمیٹی کے ہر جلسہ میں پیش پیش رہتے اور بعد کو جب جماعت احرار بنی تو اسکی روح رواں ایک عرصہ تک یہی تھے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ خود انھیں کے صوبے والے انھیں بھلا بیٹھے ہیں۔ بڑی تلاش کے بعد پتہ چلا کہ اب پبلک زندگی سے قطعاً کنارہ کش ہو کر صرف وکیل کی حیثیت سے لاہور میں ہیں۔ سوانح نگار ان کی کوٹھی تک پہنچا۔ وہ بھلا اب کیا پہچانتے۔ کئی آتے پتے دیے جب کہیں جا کر پہچانا۔ اور پھر تو لپٹ کر خوب ملے، دیر تک پچھلے تذکرے کرتے رہے تقسیم ملک کے وقت کے حالات کی جو تفصیل انھوں نے بیان کی وہ بڑی حسرت ناک تھی مصالحت و مفاہمت کے سامان ہونے پر تھے عین وقت پر کیسی کیسی کہ نوبت پڑ گئی اور تقدیر الٰہی کن کن طریقوں پر بہر صورت پوری ہو کر رہی وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝

لاهور نمبر (۴)

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

قصۂ زلف مختصر نہ ہوا!!

لاہور اور لاہوریات کے ذکر میں آخر کچھ تو ایسی دلکشی ہے کہ بات ختم ہونے ہی نہیں آتی ۔ اور یقین تو ہے کہ جب قصہ گو کی زبان نہیں تھکتی اور دل نہیں اکتاتا تو سامعین کا دم کیوں گھبرائے اور کیوں وہ انگڑائی پر انگڑائی لینے لگیں! ——— ذکر لاہور کے ملاقاتیوں اور کرم فرماؤں کا چل رہا تھا ۔

صدق کے ایک خصوصی کرم فرما فیروز پور روڈ پر رہتے ہیں ۔ خان بہادر عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ ۔ پہلے سرکاری وکیل تھے ۔ مدیر صدق کے علیگڈھی ہمعصر، اپنے زمانہ کے بڑے ممتاز طالب علم، یونین کے وائس پریسیڈنٹ، تیز، طرار، ذہین، خوش تقریر اور چھریرے جسم کے خوش قامت نوجوان، خدمات ملی کا چسکا اسی وقت سے پڑا ہوا۔ مولانا محمد علی کے پرستاروں میں شامل، اب جو ۴۲، ۴۳ سال کے بعد ملنا ہوا: تو وہ نقشہ ہی سرے سے بدلا ہوا۔ تا ستر پردہ "رنگ رمیدہ و بو" لیکن سیرت کے جوہر شاید اب کہیں زیادہ چمکدار ہوگئے ہیں اور اخلاص کی دولت کچھ اور ترقی ہی پر ہے ——— بیچارہ کھلانا پلانا بہت کچھ چاہتے تھے ۔ وقت اس کے لیے کسی طرح نہ نکل سکا اور مان سے دل کو شرمندگی ہی رہی ۔

مہروسالک کے لئے شاید پہلے کہہ آیا ہوں کہ ایک زمانہ میں لاہوری صحافت کے

آفتاب و ماہتاب تھے اور اپنا لاہور اس وقت عبارت انھیں دونوں کی ذات سے تھا، ان میں سے مہر صاحب سے تو سلسلہ مجلس خلافت دہلی اور لکھنؤ میں بار بار ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں، سالک صاحب سے شخصی نیاز ابھی پہلی بار حاصل ہوا۔ اور یکجائی متعدد صحبتوں میں رہی، خوب شخص نکلے جتنا سنا تھا اس سے بہتر ہی انھیں پایا، علم مجلس کے ماہر، بڑے زندہ دل، بڑے بذلہ سنج بڑے حاضر جواب لطیفہ گوئی میں ان کا مقابل اور ان سے ٹکر لینے والا تو خاص لاہور ہی میں ایک آدھ اُستاد اور بھی موجود ہے لیکن جو شان خصوصی حضرت اکبر الہ آبادی کی تھی، اس کی جھلک اگر کہیں دیکھنے میں آئی تو سالک ہی کے ہاں۔ وہی حکیمانہ نکتہ سنجی اور وہی چلتے ہوئے اشعار میں بے تکلف تصرف اور اصلاح کا ملکہ اس ـــــ ان کے صاحبزادہ عبد السلام خورشید ایم۔ اے کا بس سرسری ہی آمنا سامنا ہوا۔ ہر طرح ہونہار و قابل التفات نظر آئے۔ اسکول آف جرنلزم کے استاد ہیں جی میں تھا کہ اس موضوع پر اور دوسرے موضوعوں پر بھی ان سے دل کھول کر گفتگو کیجیے، وقت میں مطلق گنجائش نہ نکل سکی ـــــ مہر صاحب سنجیدہ ہمیشہ کے تھے اب سنجیدگی میں ترقی ہو گئی ہے۔ ڈر ہے خشکی تک نہ پہنچ جائے روشن خیال بھی شروع سے تھے، اب روشن خیال تر نظر آئے۔ ڈر ہے کہ تجدد تک نہ پہونچ جائیں۔ کھلانے پلانے میں دریا دلی برتی اور گفتگو میں ایڈیٹر اور صحافی سے زیادہ مفکر و مصنف دکھائی دیے۔

اپنی برادری والوں میں ایک صاحب امیر الدین قدوائی ایم، اے۔ ایل، ایل، بی تھے۔ علیگڈھ کے ممتاز اولڈ بوائے اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم کے شاگرد رشید، بڑے پرجوش مسلم لیگی تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے ہیں۔ اور یونیورسٹی میں لکچرر (استاد قانون) ہیں۔ ان کے متعلق یہ لطیفہ یہاں عجیب سننے میں آیا کہ جب یہ شروع شروع یہاں آئے ہیں تو ان کے قدوائی ہونے کی بنا پر یہاں کی خفیہ پولیس انھیں وزیر سرکار ہند

رفیع احمد قدوائی کا بھائی سمجھی اور منجر یہ نکالا کر ہونہ ہو، یہ یہاں جاسوسی کی غرض سے آئے ہیں چنانچہ شاید ان کی نگرانی بھی جاری رہی! ایک ظلمۂ خیال کے تلک ہیں، اور یہاں اپنی ہمت و حوصلہ کے لائق کام کا میدان نہیں پاتے، اچھا ہے، اگر ان کے لئے ارض حرم (خصوصاً مدینہ منورہ) میں قیام کی کوئی صورت نکل آئے تاکہ وہاں یہ دل کھول کر اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھ سکیں۔

دوسرے ملنے والوں میں نام مولوی فضل قدیر ندوی اور مولوی رشید اختر ندوی کے اور خیال میں آرہے ہیں۔ یہ دونوں ندوی ہونے کی بنا پر گویا اپنی برادری ہی کے لوگ ہیں اور مولوی فضل قدیر صاحب کی پرجوش مذہبیت تو بالکل ظاہر ہی ہے۔ صدق نوازوں میں ایک صاحب محسن درین صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ غالباً محکمہ ڈاک میں کسی عہدہ پر ہیں ــــ جن صاحبوں سے ملاقات نہ ہوسکی اور ان کی ملاقات کی حسرت ہی لئے ہوئے لاہور سے روانگی ہوگئی۔ ان میں نمبر اول پر نام ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ) کا ہے۔ فلسفہ تصوف پر انگریزی میں لکھنے والے اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم کے شاگرد رشید غالباً یہاں کالج میں پرنسپل ہیں۔(1) صدق کے ایک اور مخلص حکیم سید علی احمد نیر واسطی کا بھی ایک نامۂ محبت مثلاً مدہ وطن میں مل چکا تھا۔ خدا معلوم ملاقات کس طرح رہ گئی۔ اور ہاں رستم زماں گاما پہلوان کی زیارت کی بڑی تمنا دل میں تھی۔ گو اب شمع جھلملا رہی ہے اور وہ بیچارے رستم دوراں اب نام ہی کے رہ گئے ہیں۔ پھر بھی ان کی ذات مسلمانوں کا نام اونچا کئے ہوئے ہے اور ایسی ہستی کی زیارت بجائے خود ایک عبادت ہے ــــــ فرصت ہوتی تو روزنامہ پیسہ اخبار (مرحوم) کے اُجڑے ہوئے دفتر کی زیارت کو بھی ضرور جاتا اور اس کھنڈر سے عبرت ــــ کے بڑے سبق حاصل کرتا۔ نئی نسل کو کوئی کیا بتائے کہ آج سے ۴۵ سال قبل پیسہ اخبار پنجاب ہی میں نہیں سارے ہندوستان کی

(1) بعد کو علم ہوا کہ اسلامک کلچرل ٹرسٹ کے ڈائرکٹر ہیں

اُردو صحافت میں کیا درجہ رکھتا تھا

زندہ اخبار نویسوں میں مکّش صاحب سے کبھی ملاقات، کی آرزو ہی رہ گئی۔ آج کل اپنا روزنامہ نوائے پاکستان نکال رہے ہیں۔ ثقہ راویوں سے سننے میں آیا کہ لاہور میں گنتی کے چند با اصول اور صاحب ضمیر و دیانت ایڈیٹر صاحبان ہیں، یہ انھیں میں سے ہیں ـــــ اور اس وقت کسی کے لئے یہ داد بڑی داد ہے ـــــ فرصت زندوں ہی سے نہ ملی تو قبرستانوں تک کیا پہونچ سکتا تھا۔ اگرچہ ناممکن ہوتا تو ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم ایم اے، پی۔ ایچ ڈی کی تربت پر ضرور حاضری دیتا۔ علیگڈھ میں مدتوں صدر شعبہ فلسفہ رہے۔ صورت دیکھیئے تو داڑھی کی درازی اور چہرہ کی نورانیت کے لحاظ سے روایتی خواجہ خضر اعتقاد کے لحاظ سے بڑے پختہ مومن بلکہ مومن گر ـــــ یہ انھیں کا فیض تصرف تھا کہ مسلم یونی ورسٹی کے بعض اور شعبوں میں الحاد اور بیدینی کی جتنی بھی گرم بازاری رہی ہو، عین اسی دور میں شعبۂ فلسفہ اس وبا سے نہ صرف محفوظ و غیر متاثر رہا، بلکہ اُلٹے اسکی اصلاح و علاج میں خاصی حد تک کامیاب رہا ـــــ لوگوں نے بزرگی اور ولایت کا اپنے دماغ میں ایک محدود و مخصوص سانچا تیار کر رکھا ہے۔ حالانکہ جو کوئی بھی پختہ ایمانی کے ساتھ خدمت دین و عمل صالح کی راہ اختیار کرے وہ بے کھٹکے بزرگ اور ولی اللہ ہو سکتا ہے۔

لاہور کا ایک نامور ادارہ ثقافت اسلامیہ یا بزم اقبال ہے۔ یہ گو ضابطے سے سرکاری نہیں لیکن گراں بہا سرکاری امداد کی بنا پر نیم سرکاری ضرور ہے اور اسکی حیثیت نیم دینی تعلیمی یا اسی کی زبان میں "ثقافتی" ہے اس کے صدر یا ڈائرکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، سابق صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونی ورسٹی (دکن) ہیں۔ اور اس کے دوسرے

کارکنوں میں مولانا شاہ محمد جعفر ندوی، مظہر الدین صدیقی صاحب اور مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی بھی شامل ہیں۔ اس کی مطبوعات کی تعداد (۳۰)، (۴۰) سے کیا کم ہوگی ان میں سے (۸)، (۱۰) انگریزی میں بھی ہیں۔ بعض پر ریویو صدق میں بھی نکل چکا ہے اور اس کے ماہنامہ ثقافت کا تذکرہ بھی اس کے صفحات پر آچکا ہے ادارہ کے دیکھنے کا کمال اشتیاق تھا۔ قیام کا آخری دن تھا کہ آرزو پوری ہوئی۔ دوپہر کا وقت فضلی صاحب بھی ساتھ تھے۔ دیکھا تو ادارہ کے کاروبار کا جتنا اندازہ تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع پایا۔ ایک لق و دق عالی شان عمارت، اور بڑے صاف ستھرے آراستہ کرے۔ رفیقوں سے بات رہی، اور سب سے بڑھ کر خود خلیفہ صاحب سے۔ خلیفہ صاحب کے عقائد اور شخصیت دونوں سے متعلق عجیب غریب روایتیں پڑھنے میں آچکی تھیں، مگر ملاقات کے وقت تو ان کی سیرت کا روشن ہی رُخ پیش نظر رہا۔ اور گفتگو وہ بڑی سلجھی ہوئی کرتے رہے۔

چلتے وقت کتابوں کا ایک بڑا سا پشتارہ ساتھ ہوا۔ سرسری نظر کرنے سے اندازہ ہوا کہ ادارہ کام تو واقعی بہت کر رہا ہے اور مسلمانوں کے عام اداروں کی طرح معطل، جامد، اور مجہول نہیں بلکہ فعال، متحرک و سرگرم کار ہے۔ البتہ سوال یہ رہتا ہے کہ کام دینی وملی اعتبار سے مفید بھی ہے یا اس کے برعکس، رہنما ہے یا غارتگر دین ومصالح ملت ہے؟ — اس کے تفصیلی جواب کا یہ موقع نہیں۔ اجمالاً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بعض گروہوں خصوصاً پرویزیوں اور کمیونسٹوں کی تردید میں اور عام مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حق میں تو ادارہ یقیناً مفید علمی اور ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے اور بحیثیت مجموعی اس کا شمار انھیں اداروں میں ہونا چاہئے جن کے خیر کا پہلو ان کے شر کے پہلو پر غالب ہے لیکن نکتہ چینوں کو جو شکایت خود ادارہ کی بعض اعتقادی گمراہیوں اور بے احتیاطیوں سے ہے وہ بھی بے اصل نہیں گو مبالغہ آمیز ہو۔

اتفاق سے عین اسی زمانہ میں امرتسر میں ہاکی میچ تھا۔ اور ان آنکھوں نے دیکھا کہ تماشا دیکھنے کے لئے سارا شہر لاہور ڈھلا چلا جا رہا تھا! ریل سے، بسوں سے، سائیکلوں سے، تانگوں سے ہر ممکن سواری سے، ہزار ہا لاہوری امرتسر کے لئے رواں تھا۔ سڑکوں پر وہ ہجوم کہ راستہ چلنا دشوار۔ کبھی "دو دشمن" ملکوں میں ایک دوسرے کے کھیل دیکھتے دکھانے کا یہ گرما گرم اشتیاق کہیں اور کبھی دیکھا گیا ہوگا؟ —— زندہ باد راجا غضنفر علی خاں! آخر پرانے کھلاڑی ہیں۔ کھیل کھیل میں اس پاکستانی ہائی کمشنر نے اتحاد و اشتراک کا وہ تماشا دکھایا کہ فریقین کے بڑے بڑے گھاگ اہل سیاست منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

عین اسی وقت افغانیوں کے ہاتھوں پاکستان کے قومی جھنڈے کی توہین کا قصہ بھی پیش آیا تھا۔ اور اس کے متعاقب بلوے اور فسادات، خونریزی، اور زبان و قلم سے آتش باری! ہندوستان کا معاملہ تو اس وقت دب دبا سا گیا تھا، غصہ و جوش انتقام کا سارا رخ ہم نے دیکھا کہ افغانستان کی طرف پھرا ہوا ہے۔ مختلف مجلسوں اور صحبتوں میں یہی چرچا اور اخبارات کی سرخیوں سے گویا خون ٹپکتا ہوا —— پاکستان کی ہوا خواہی کی بنا پر دل اس خیال سے بھی لرزتا تھا کہ اپنی موجودہ بے سروسامانی اور اندرونی خلفشار کی حالت میں پاکستان کو دنیا کی کسی چھوٹی سی چھوٹی سلطنت سے بھی آویزش کرنا پڑے چہ جائیکہ افغانستان جیسے مسلم ہمسایہ سے! لیکن جوش و خروش کے نقار خانہ میں صلح و آشتی کی ایک ضعیف و نحیف آواز بھلا سُن ہی کون سکتا تھا!

(۷)

لاہور سے کراچی تک

دن گزرتے دیر کیا لگتی ہے۔ بات کتنے ۳ ½ ۳ دن کی مدت ختم ہو گئی۔ اور ۱۰ اپریل کو صبح مسافر کا قدم خیبر میل سے کراچی کے لئے اٹھ گیا۔ ٹکٹ کے سرکاری انتظامات سرفراز احمد صاحب اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر کی مہربانی سے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ اسٹیشن آیا تو علاوہ میزبان اور ان کے عزیزوں کے مولوی رئیس احمد جعفری، خواجہ شفیع دہلوی اور اشرف صبوحی وغیرہ کو موجود پایا۔ اور انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے اگلے اسٹیشن پر سرفراز صاحب بھی ملے خواجہ شفیع سلمہ اللہ کی تواضع و فروتنی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اسٹیشن پر آکر اور گاڑی چھوٹتے وقت مجمع عام میں تو انھوں نے اپنی خاکساری کا مظاہرہ اس بلا کا کیا کہ بس کٹ کر رہ گیا! ـــــ کوئی آٹھ (۸) کا وقت ہوگا کہ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب کراچی کہیں کل صبح تقریباً اسی وقت پہونچے گی ۲۲ ½ ۲۳ گھنٹہ کا وقفہ اچھا خاصہ سوچنے سامنے کا ل گیا! ـــــ ہندوستان کی گاڑیوں میں تو اکثر ہمسفر غیر مسلم ہی ہوتے تھے۔ یہاں اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی لیکن اتفاق سے عین اسی درجہ میں ایک یورپین کیتھولک پادری صاحب سفر کر رہے ہیں۔ صلیب گردن میں لٹکی ہوئی ہے مسلمانوں میں بھی گلے میں نقش، تعویذ وغیرہ ڈالے رہنے کا رواج عجب نہیں جو انھیں قوموں سے آیا ہو۔

لاہوریوں سے مل جل کر ایک بڑا افسوس ناک اور تکلیف دہ پہلو پاکستان کا نظر کے سامنے آگیا تھا۔ کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کی طرف سے صاف نہیں۔ اور عوام و خواص سب مل کر کہنا چاہیئے کہ حکومت کی طرف سے غیر مطمئن۔ ہندوستان میں رہ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی طرف سے بے اطمینانی شاید ہمیں کا حصّہ ہے۔ لاہور پہنچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہاں یہ وبا وہاں سے کچھ شدید تر ہی ہے۔ اب حکومت "اپنی" ہے۔ چاہیئے تھا کہ اسے ہر ہر فرد "اپنی" سمجھتا۔ واقعتاً صورت حال اس کے برعکس، بہ استثنائے قلیل شاید کوئی بھی "اپنی" نہیں سمجھتا! نکتہ چینی کا انداز بالکل "غیروں" کا سا۔ اور لہجہ کی تلخی اس احساس مغایرت کا قدرتی نتیجہ! اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو کہتے ہوئے پایا کہ "یہاں آیا ہی کون۔ مسلمانوں کا دل دماغ تو ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ آخر کی بھرتی ہمارے نصیب میں آئی۔ مولوی ہوں یا لیڈر سب تھرڈ کلاس ہمارے حصّہ میں پڑے۔ ابتری اور افراتفری اس کا لازمی نتیجہ ہونا ہی تھا" ـــــ شکایت کا یہ جزو تمام تر بیجا اور خلاف واقعہ تھا۔ طبقۂ علماء میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد شفیع دیوبندی اور مولانا ظفر احمد عثمانی آخر یہیں منتقل ہوآئے۔ سیاسی لیڈروں میں لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، خواجہ ناظم الدین سب نے اسی ملک کا انتخاب کیا۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے چوٹی کے لوگ ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور اساتذۂ فن یہیں آگئے، ڈاکٹروں، بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں، انجینیروں، تاجروں کے چیدہ چیدہ افراد اسی سرزمین پر آکر بس گئے۔ وسیم صاحب، فیاض علی صاحب، لاری صاحب کس کس کے نام گنائے جائیں۔ بابائے اردو عبدالحق ہندوستانی سے پاکستانی ہوگئے۔ سیماب اکبرآبادی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی، شوکت تھانوی، سید ہاشمی فرید آبادی، رازق الخیری اور ملّا واحدی نے اپنا وطن اُجاڑ اسی سرزمین کو آباد کیا۔ میر لائق علی حیدرآبادی بھی

شاہ صنعت و حرفت، ملک غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین جیسے ماہرین فنانس اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی جیسے کیمکل ایکسپرٹ سب کھنچ کر یہیں آرہے اور کوئی منتخب ناموں کی فہرست مکمل کرنا چاہے تو بیسیوں کی نہیں پچاسوں کی پہنچے گی۔ ان سب بابرکت وجود کو ٹھکرانا' نہ قدر شناسی کا اچھا نمونہ ہے، نہ شکرگزاری کا۔ اور ان میں سے بعض اگر بہت جلد اللہ کو پیارے ہوگئے تو اس میں بندہ کا کیا قصور؟ ـــــــ اصل یہ ہے کہ امیدیں ہی قیام پاکستان سے بہت زیادہ قائم کرلی گئی تھیں اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اس کے وجود میں آتے ہی مشکلات چشم زدن میں دور ہوجائیں گی اور بغیر انتہائی جدوجہد، ایثار و قربانی کے ہر دشواری خود بخود حل ہوتی چلی جائیں گی! افسوسناک اندرونی آویزش اور باہمی چپقلش میں قصور یقیناً مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کا بھی ہے۔ لیکن عام پبلک اور اس کا کوئی بھی طبقہ اپنے حصہ کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے اپنے حصہ رسدی کے مطابق قصور وار سارے ہی فریق ہیں۔ کاش مسلسل دوسروں کی نکتہ چینی اور دوسروں ہی کی عیب جوئی کے بجائے خود تنقیدی اور احتساب نفس کے ہم خوگر ہوتے!

ادھر دماغ اسی طرح کے سوچ سارچ میں لگا ہوا تھا اور کچھ وقت مطالعہ کتب میں صرف ہو رہا تھا۔ اور اُدھر راستہ طے ہوتا جارہا تھا۔ ایک اسٹیشن اور پھر دوسرا اور تیسرا۔ لیکن یہ ایک نئی بات کیا ہے کہ ہر پلیٹ فارم پر ایک نمایاں ستون سے بندھا ہوا ہاتھ رہنمائی کس جانب اور نشاندہی کس چیز کی کر رہا ہے؟ ـــــــ **یہ قبلہ نما ہے اور نشاندہی سمت قبلہ کی ہو رہی ہے!** لاہور سے کراچی تک سات سے سات سو میل تک رہنمائی سمت قبلہ کی اسی طرح ہر اسٹیشن پر ہوتی رہے گی! دل نے جزائے خیر کی
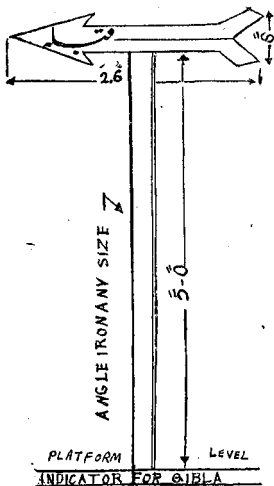
... یہ قبلہ نما ہے اور نشاندہی سمت قبلہ کی ہو رہی ہے

دعا حکام ریلوے کے لئے نکلی ـــــ کم سے کم پاکستان ریلوے کا محکمہ تو کچھ لاج پاکستانی اور مسلم مملکت ہونے کی رکھے ہوئے ہے! گاڑیوں پر اُردو خط میں "پاکستان ریلوے" لکھے ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرا نظارہ اس سے بھی کہیں بڑھ اور خوشگوار تر حسن قلب سمانی کا رہا ـــــ مسلم مملکت برائے نام بھی بہر حال مسلم ہی مملکت ہوتی ہے ـــــ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

اسی مقام و منزل کا ترجمان ہے

لوگوں نے ڈرا رکھا تھا کہ راستہ ریگستانی ہے۔ پانی کا قحط اکثر اسٹیشنوں پر ہوگا۔ اس لئے صراحیاں خوب خوب پانی سے بھری ہوئی ساتھ رکھنا۔ اور راہ میں گرد و غبار اڑے گا۔ آندھی کا سماں ملے گا ـــــ ان دونوں باتوں میں سے پہلی تو بہت ہی مبالغہ آمیز نکلی، پانی ماشاء اللہ ہر جگہ بہ افراط ملتا رہا۔ دوسری بات البتہ خاصی حد تک صحیح نکلی گرد و غبار سے سابقہ تو ریل کے تقریباً ہر بڑے سفر میں پڑتا ہی رہتا ہے مگر اس راستہ میں اور زیادہ رہا۔ لیکن کھڑکیاں چڑھا لینے سے اور ان کے نیچے کی پٹری پر جہاں دو دراز سے ملحق ہوتی ہیں پانی ڈالتے رہنے سے بہت کچھ امن حاصل ہو جاتا ہے۔ باہر سے گرد کے فراٹے اگر وہیں پانی کی تری پا کر جم جاتے ہیں۔ درجہ کے اندر بہت کم آپاتے ہیں: ایک مخلص عزیز اور بڑے "صدق" نواز شیخ فہیم الزماں رامپوری (اب۔ زماں) پاکستانی ہوائیہ میں اسکواڈرن لیڈر پشاور سے لاہور رخصت سے کر آگئے تھے اور وہاں بھی بڑے کار آمد اور بڑے کار گزار ثابت ہوئے تھے۔ انھیں نے یہ تدبیر بتائی تھی اور اپنے تجربہ میں خاصی کامیاب

اسٹیشن پر اسٹیشن گذرتے رہے۔ یہ ملتان آیا۔ وہ بھاول پور گذرا۔ یہ خانپور ملا۔ وہ

خانیوال نظر آیا۔ ابھی گاڑی سمہ سٹا سے گذری اور ابھی حیدرآباد پر آ کی پنجاب ختم ہوا یہ سندھ کے حدود شروع ہوئے ــــ ہر بڑے اسٹیشن پر ان علاقوں میں اُمت کی ذو سو سالہ پرانی تاریخ کا دفتر گویا دماغ کے سامنے کھل جاتا تھا۔ سندھ میں مسلمانوں نے یوں پہلا قدم رکھا ہوگا۔ اجنبی ملک میں، اجنبی سرزمین میں کیسی کیسی دقتیں اٹھائی ہوں گی۔ کیا کیا مجاہدے کئے ہوں گے صبر و ہمت کے امتحانات کیسے کیسے دیے ہوں گے۔ دریائے سندھ کو یوں عبور کیا ہوگا۔ پنجاب پر رفتہ رفتہ یوں قبضہ کیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ سارے علاقہ پر یوں پھیلتے گئے ہوں گے کتنوں نے جامِ شہادت یہیں پیا ہوگا۔ کتنے زندہ سلامت آگے بڑھے ہوں گے کس دل و جگر کے تھے جنھوں نے اذان کی پہلی آواز اس سرزمین پر بلند کی ہوگی! تبلیغ میں کیسی کیسی جانگداز دشواریاں شروع میں پیش آئی ہوں گی۔ کتنے گمنام غازیوں اور مجاہدوں کے لاشے اس سرزمین میں امانت ہوں گے جن کی قبروں کے نشان صدہا سال ہوئے کہ مٹ چکے ہیں۔

بھاولپور اسٹیشن کے نظارہ سے قلب نے تاثر خصوصی قبول کیا۔ پولیس کے جوانوں کی وردی کا ایک جزو "ترکی ٹوپی" تھی اب اس کی کوئی اہمیت کیا بیان کرے! آنکھیں اس کے دیکھنے کو گویا مدت سے ترسی ہوئی تھیں۔ ایک زمانہ تھا یہ "علامت نیچریت" کی تھی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں اسلامیت کا نشان بن گئی اور داڑھی کی طرح یہ بھی غیروں سے اپنوں کو ممتاز کرنے لگی اور حیدرآباد دکن میں تو کثرت سے ہندوؤں کو بھی اسے استعمال کرتے دیکھا تھا گویا یہ ایک علامت اعزاز کی تھی۔ دیکھتے دیکھتے یہ زمانہ آگیا کہ یہ عنقا کے حکم میں داخل ہوگئی! یہاں تک کہ علیگڑھ جو اس کی اصلی منڈی تھی وہاں سے بھی رخصت ہوگئی۔ آج جو اس کی از سر نو بہار دیکھی گویا روح تر و تازہ ہوگئی۔ پرانی یادوں کی بھی کیا بات ہوتی ہے!

سہ پہر کا وقت تھا کسی اسٹیشن پر کراچی کا مشہور انگریزی روزنامہ "ڈان" خریدا

(اس سے پہلے تو لاہور ہی کے اخبارات ملتے رہے تھے) ۷/ (اپریل ۱۹۵۰ء کا پرچہ تھا دیکھتا کیا ہوں کہ خبروں کے صفحہ پر سرسرے ورود کراچی کی اطلاع جلی سرخی کے ساتھ درج ہے۔ غضب کر دیا اس اخبار نے بھی۔ اب جو نہ جانتے ہوں گے وہ بھی میری آمد کو جان جائینگے اور سٹیشن پر ضرور ہجوم کریں گے! ـــــ خیر اتنا غنیمت ہے کہ کراچی کے دو اسٹیشنوں میں سے کسی کی تعیین اس میں نہیں۔ کچھ لوگ یقیناً غلط اسٹیشن پر پہنچیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ گاڑی کا نام بھی اس میں غلط چھپا ہے۔ میں تو خیبر میل سے چل رہا ہوں اور اس میں چھپا پنجاب ایکسپریس ہے! بہت سے لوگ بیچارے ضرور اس سے تکلیف اٹھائیں گے اور میری تلاش میں بھٹکیں گے لیکن بہرحال استقبالی ہجوم میں تو کمی رہے گی ـــ لیکن یہ کسے معلوم کہ خبر کی اشاعت "ڈان" ہی تک محدود ہے کسی اردو اخبار نے بھی اگر چھاپ دی تو اور بھی غضب ہوگا۔ صبح ہوئی اور کراچی کی دلکش فضا میلوں قبل سے شروع ہو گئی۔

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر ست!

اور یہ شہر تو ایک نہیں خدا معلوم کتنے عزیزوں، دوستوں مخلصوں اور بزرگوں کا مدفن ہے۔ مولانا سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا مسعود عالم ندوی، گلنار بیگم وسیم صاحب۔ چودھری خلیق الزماں کے دو چھوٹے بھائی سعید الزماں و شفیق الزماں حکیم وزیر حسن لکھنوی۔ چودھری نعیم اللہ، تفضل کریم دریابادی وغیرہم رحمہم اللہ علیہم۔ نام کن کن کے یاد آتے چلے جاتے ہیں۔

---

(۸)
کراچی نمبر (۱)
مُخلِصوں کے جُھرمُٹ میں

اسٹیشن آگیا۔ اور یہ کراچی کا پہلا یعنی کنٹونمنٹ اسٹیشن ہے۔ گاڑی رُک ہی رہی تھی کہ مجمع پر نظر پڑ گئی، اور ہجوم سے اندازہ ہوگیا کہ یہیں اُترنا ہے، اپنے عزیزوں اور قدیم مخلص شناساؤں ہی کی تعداد ماشاء اللہ اس شہر میں کیا کم تھی کہ اخباری اطلاع کی بنا پر نئے نئے مخلصین اور کرم فرماؤں کا اضافہ، فلاں بھائی اور فلاں بھتیجے، یہ ملا واحدی، وہ رازق الخیری یہ محمد عشیر چیف نیوز ایڈیٹر "ڈان"، وہ سعید الحق چیف نیوز ایڈیٹر کراچی ریڈیو، یہ ضیاء الدین احمد برنی اور وہ بشیر احمد صدیقی۔ یہ ابو عاصم، وہ سلیمان اور سب سے نمایاں انگریزی پندرہ روزہ الاسلام والے خواجہ عبد الوحید لاہوری ثم کراچوی، ان سب سے ملے جلے نئے نئے چہرے یہ فلاں پارٹی کے سکریٹری ہیں۔ اور وہ فلاں انجمن کے نمائندہ ہیں اور اکثر سے تعارف خواجہ عبد الوحید کرا رہے۔ انھیں "صدق" نوازوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی ملے جنھوں نے مصافحہ والے ہاتھ سے "صدق" کے پتہ کی چِٹ بھی ہاتھ میں تھمادی۔ گھر پہنچکر جب اس چِٹ کو دیکھنے کی مہلت ملی۔ تو دیکھا کہ اس کے اندر ایک معقول رقم کا نوٹ بھی صدق کی امداد کے لیے رکھا ہوا ہے! اور ذرا آگے بڑھے تو کیا دیکھا کہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبد الحق بہ نفس نفیس چلے آرہے ہیں! اس سن و سال میں یہ جوانہمتی اور اپنے ایک خورد کی عزت افزائی، ان کا کرم ہی کرم ہے۔ مصافحہ اور معانقہ کا شوق ہے کہ اُبلا پڑتا ہے تو وارد مسافر کی جان غضب میں کہ

ادھر اسباب کو سنبھالے یا ادھر ان استقبالیوں کا دل نہ تھوڑا ہونے دے! حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایتوں کی قدر ایسے ہی موقعوں پر ہوتی ہے تاکید ہے کہ نو وارد مسافر پر اکبارگی ہجوم نہ کرو۔ اسے اطمینان سے اتر لینے دو۔ سامان اتروا لینے دو ——— دل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں جانا ہوگا اور اتنے عزیزوں، مخلصوں میں سے کس کے ہاں ٹھہرنا ہوگا کہ یکایک گورنر جنرل بہادر کے اے ڈی سی کی سفید براق وردی نمودار ہوئی۔ اور لفٹنٹ امام کی خوشگوار آمد نے اس تذبذب سے نجات دلا دی۔ جہاں کی منزل وہی ٹھہری جو معزز میزبان کا قصر عالی تھا۔ دو سرکاری موٹر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور منٹوں کے اندر راس افریکے مسافر کی پوری پارٹی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل تھی! ——— غالب کا مشہور مصرعہ

کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یوں بھی تو پڑھا جا سکتا ہے۔ ع

کبھی ہم اپنے کو اور ان کے گھر کو دیکھتے ہیں!

گورنمنٹ ہاؤس کو اپنے لکھنؤ میں لاٹ صاحب کی کوٹھی کہتے ہیں۔ اور یہ تو لاٹ صاحب کی نہیں۔ بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں صوبہ کے گورنر رہا کرتے ہیں یہ تو گورنر جنرل ہاؤس کہلاتا ہے۔ اس کے رقبہ کی وسعت کا، اس کے تکلفات کا، حسن انتظام کا کیا کہنا۔ لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس میں جانے کا اتفاق چند بار ہوا ہے۔ نینی تال کا گورنمنٹ ہاؤس بھی دیکھا ہوا ہے۔ یہ گورنر جنرل ہاؤس قطعًا تو ان دونوں سے بڑھا ہوا نظر آیا۔ اس کی ٹکر کا اگر ہے تو دہلی کا سابق وائسریگل لاج یا موجودہ راشٹرپتی بھون ——— جگہ

بالائی حصہ میں ان کمروں میں ملی جن میں سنا ہے کہ کبھی خود بدولت رہتے تھے (اب نیچے کے حصہ میں رہتے ہیں) کمروں میں تختی میری اور بیوی کے ناموں کی لگی ہوئی۔ بغلی کمرہ پر تختی میرے سکریٹری کے نام کی، آب و ہوا کا پوچھنا ہی کیا جس موسم میں بھی رہیئے موسم کی سختی کا گذر ہی نہ ہو۔ گرمی میں ٹھنڈا۔ ٹھنڈک میں گرم، ہر موسم میں معتدل مادی آسائش کے سامان اور اس فراوانی کے ساتھ کہ گویا جیسے جی اپنے ظرف کے لائق ایک ہلکا سا نمونۂ جنت کا دکھا دیا۔ کھانے اور ناشتہ کا پروگرام، نماز پنجگانہ کی طرح دن رات میں پانچ پانچ وقت کا۔ باریابی پہلے دن آٹھ بجے شب کو ہوئی۔ وقت چند منٹ کا مقرر ہوا۔ اور اس سے قبل اے۔ ڈی۔ سی آکر اپنے ہمراہ لے گئے، کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے۔ گفتگو عام مزاج پرسی کے بعد نجی قسم کی ہوتی رہی۔ ادھر سے سوالات صحت و طریق علاج وغیرہ سے متعلق رہے۔ اُدھر سے ایک پہلا سوال یہ ہوا کہ کہیئے دوران قیام میں ارادہ کیا کرنے کا ہے؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ "اور کوئی ارادہ نہیں بجز دوستوں عزیزوں سے ملنے ملانے کے۔ اور کسی پبلک مشغولیت کا تو بہرحال خیال ہی نہیں"۔ اس پر بڑی مسرت کا اظہار ہوا۔ اور فرمایا کہ "بس یہ ٹھیک ہے۔ ملئے ملایئے۔ کھایئے۔ پیجیے۔ سیر کیجیے"۔ دل نے اس پر بڑا ہی شکرادا کیا، کہ بڑی ذمہ داریوں سے نجات مل گئی۔ اگر کوئی سیاسی موضوع چھڑ جاتا یا چھیڑنے کی بنیاد ہی پڑجاتی تو خدا معلوم گفتگو کیا صورت اختیار کرتی اور فریقین میں کس کو کتنا دل مارنا پڑتا۔ یا دوسرے کا دل رکھنے کے لئے خود کتنی مداہنت کرنا پڑتی۔ اللہ ٹھنڈی رکھے اس شاعر کی تربت کو جو ہم پست ہمتوں اور ناتوانوں کی کیا خوب ترجمانی کر گیا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

سیدسلیمان ندوی) صاحبؒ کے نقل مکانی کے بعد سے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی صدارت
مجلس کارکن کا بار بھی اسی دوش ناتواں پر ہے۔ ادارہ کے ایک مستعد کارکن اور مجلس ادارت معارف
کے نائب ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے ادارۂ مذکور ہی کے کام کے لئے کراچی آئے
ہوئے تھے۔ ناظم مالیات مولوی مسعود علی صاحب ندوی (ہم نیازمندوں کی زبان میں
"مسعود غازی") عمل و کارگزاری کے پتلے ہیں۔ ہندوستان میں تو بڑے لوگوں سے مل ملاکر
پنڈت جی اور مولانا ابوالکلام اور رفیع قدوائی مرحوم کے اثرات سے کام لیکر وہاں اس
ڈوبتی ہوئی ناؤ کو منجدھار سے نکال چکے ہیں۔ انھیں نے پاکستان میں کام کرنے اور کتابوں
کے لئے کاروباری امداد حاصل کرنے کے لئے صباح الدین سلمہٗ کا انتخاب کیا تھا اور انھیں اس
مشن پر دو چار ہفتہ قبل روانہ کر چکے تھے۔ عزیز موصوف اپنی والی دوڑ دھوپ کر چکے تھے اسٹیشن پر
ملے۔ اور ہیں ہجوم میں سے اکیلے انھیں کو چن کر اپنے ہمراہ گورنر جنرل ہاؤس لیتا آیا تھا۔ ان کی
اصل امتیازی حیثیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ بہرحال فرودگاہ پر پہنچتے ہی قبل اسکے
کہ چائے اور ناشتہ سے فراغت کی جائے انھیں سے بات چیت شروع ہوگئی اور کچھ دیر میں ان
سارے ضروری مراتب معلوم کر لئے گئے۔ اس کے بعد اس دن تو وہ رخصت ہوگئے لیکن دوسرے
ہی دن دوپہر کو ان کے کام کا انتظام بحمداللہ ہوگیا۔ ممتاز حسن صاحب فنانس سکریٹری حکومت
پاکستان اور قدرت اللہ شہاب صاحب پرائیوٹ سکریٹری گورنر جنرل بہادر، دونوں مہربان
ہوگئے۔ صباح الدین سلمہٗ کو بلاکر ان سے ملا دیا گیا۔ اور گفتگو مطبوعات دارالمصنفین کی درآمد اور
کتابوں کے لائسنس وغیرہ کے مسائل پر خوب کھل کر ہوگئی۔ بحمداللہ نتیجہ خاطر خواہ ظاہر ہوا۔ اور
چند روز بعد انتظامات مکمل ہوگئے۔ اعظم گڑھ سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم علمی اور
غازی مسعود ناظم مالیات دونوں کے شکریہ کے خطوط خواہ مخواہ آنے لگے، حالانکہ اس میں دخل اس

نامۂ سیاہ کی سعی و جہد کا ذرہ بھر بھی نہیں فضل و کرم کے بھی عجائب کاروبار ہیں۔ خود ہی تو بات کی بات میں پتھر کو پانی کر کے بہا دیتے ہیں۔ لوہے کو موم کی طرح پگھلا دیتے ہیں اور نام کسی بندہ کا اچھال دیتے ہیں! آہ، کہ کتنی نیکنامیوں، کتنی شہرتوں کی بنیاد ایسی ہی نقش بر آب ہے اور کتنی شخصیتیں ایسی ہیں جن کی ناموری ایسی ہی بے حقیقت اور تمام تر ایک دھوکا اور سراب ہے!

گھر پہونچا تھا کہ کرم فرما حضرات کی آمد شروع ہو گئی۔ حالانکہ رسائی ہر ایک کے لئے آسان نہ تھی اور ٹیلی فونی پیامات کی تو وہ کثرت کہ بس معاذ اللہ! گورنر جنرل ہاؤس ایک چھوٹی موٹی خود مختار ریاست سی ہے۔ یہاں کی ڈسپنسری الگ، ڈاک خانہ اور تار گھر الگ، اور اسی طرح ٹیلی فون کا مرکز بھی شہر کے ایکسچینج سے الگ۔ جن لوگوں کو آنا ہوتا، اکثر وہ اپنے مقام سے فون کر کے وقت مقرر کراتے۔ پھر جب آتے تو صدر پھاٹک پر رک کر وہاں سے پھر فون کرتے اور جب یہاں سے اجازت مل جاتی۔ جب کہیں "پاس" لیکر آ سکتے تھے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ پہلے دن کون کون صاحب آئے۔ اور کس کس کے ہاں سے فون آئے، اتنا یاد ہے کہ آنے والوں میں وہ لوگ تھے جو اسٹیشن یا تو غلط وقت کی اطلاع کی بنا پر پہونچ ہی نہیں سکے تھے اور یا بجائے کنٹونمنٹ کے سٹی اسٹیشن پر انتظار کرتے رہے! ٹیلی فون ہر ہر کمرہ میں لگا ہوا تھا۔ میں تو دو ہی چار بار کے بعد پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد فون کی ساری ذمہ داری میرے سکرٹری عزیزی ہاشم قدوائی سلمہٗ نے لے لی۔ وہی اپنے کمرہ سے ایک ایک کا جواب دیتے رہے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ اسی کام کی نذر ہوتا رہا۔ آنے والوں میں اتنا خیال ہے کہ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں سید جمیل احمد لکھنوی ثم کراچوی اور ان کے والد بزرگوار

سید خلیل احمد تھے جمیل صاحب غالباً اکاؤنٹس میں کسی اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ بڑے دیندار قسم کے ہیں اور قرآن مجید کے خاص طالب علموں میں ہیں۔ دوسرے دن کے لئے اپنے ہاں چائے پر مدعو کر گئے۔ بڑی شرمندگی اس کی ہے کہ وعدہ کے باوجود ان کے ہاں پہنچنے کا وقت نہ نکل سکا (بعض اہل تکلف نے اپنے ہاں آتا زائد روک لیا تھا) خدا کرے کہ وہ اس پبلک معذرت کو قبول فرمالیں۔ مولوی حبیب احمد ندوی (سابق سکریٹری مولانا شوکت علیؒ) بھی اسی مدد کے آنے والوں میں تھے۔ قریب شام کے اپنے ہاں سے ملنے ملانے نکلا۔ اور سب سے پہلے لکھنؤ کے مشہور و معروف حاجی مصطفےٰ خاں (سابق مالک کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی، حنا بلڈنگ) مقیم عامل کالونی ۲ کے ہاں پہنچا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ اور اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔

۹

کراچی نمبر (۲)

ایک سرسری جائزہ

کراچی ٹھہرنا پورے آٹھ دن تھا۔ ۸ راپریل (۱۹۵۵ء) کی صبح سے ۱۵ راپریل ۱۹۵۵ء کی شام تک۔ ملاقاتیں کثرت سے کرنا تھیں لیکن جس کثرت سے واقعۃً کرنا پڑیں اس کا تو اندازہ بھی نہ تھا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک ایک سلسلہ تھا کہ ٹیلیفونی پیامات کا لگا رہتا۔ اور ایک بار تو ایک پیام ۱۱½ بجے شب کو موصول ہوا! ڈاک سے خطوط کا سلسلہ اس کے علاوہ، اور کبھی کبھی بیرون کراچی سے جوابی تار بھی! اگر ہمہ وقتی سکریٹری کو ساتھ نہ لاتا تو ہوش وحواس کے لالے پڑ جاتے۔ کوئی کوئی خط اس مضمون کا ہز ایکسلنسی کے پرائیوٹ سکریٹری کے نام ہوتا کہ "براہ کرم ہماری ملاقات کا انتظام مولانا دریابادی سے کرا دیجیے"۔ اس پر وہ خط باقاعدہ ان کے دفتر سے میرے پرائیوٹ سکریٹری کے نام آتا اور یہاں سے جواب جاتا ـــــ آنے والوں کا تانتا صبح سے لگ جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ گورنر جنرل ہاؤس میں رسائی ہر شخص کی آسان نہ تھی۔ روک ٹوک کے ضابطے لازمی۔ جو صاحب وقت مقرر کرا کے آتے ان کو بھی صدر پھاٹک پہ رُکنا پڑتا۔ وہاں سے فون میرے سکریٹری کے پاس آتا اور جب یہاں سے اجازت ملتی جب وہ صاحب پاس لے کر آسکتے۔ اور واپسی میں پاس (PASS) پھر پھاٹک کے سپاہی کو دیدینا ہوتا۔ چوکی پہرا قدم قدم پہ۔ بندوقچی۔ سنتری گویا ہر وقت گشت میں، بعض لوگ کچیا جاتے اور یہ بندشیں سُن کر ملاقات ہی سے باز آجاتے۔ پھر بھی کرم فرماؤں کی کثرت میرے اندازہ سے

توبہرحال باہر ہی تھی! ۔۔۔ اس درمیان میں خود بھی جب موقع ملتا، باہر نکل جاتا۔ سواری کی کوئی دقت تھی ہی نہیں۔ ادھر فون کیا اور ادھر چند منٹ میں سرکاری موٹر آگیا۔ کئی کئی گھنٹے اسی طرح بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی سے باہر گزرتے۔ عزیزوں، دوستوں سے ملنا ملانا تھا۔ مرحومین کی تربت کی زیارت بھی کرنا تھی۔ بعض اداروں میں حاضری دینا تھی اور پھر دعوتوں اور پارٹیوں کی تو حد ہی نہ رہی۔ صبح کا ناشتہ اِن کے ہاں ہے تو دوپہر کا کھانا اُن کے ہاں۔ سہ پہر کی چاء فلاں صاحب بلا رہے ہیں تو رات کے کھانے پر فلاں صاحب بہ اصرار بلا رہے ہیں! اور پھر بندھے ہوئے اوقات پر بس نہیں سہ پہر کی چاء تین تین بار! صبح کا ناشتہ دو دو جگہ! حیرت اس پر ہے کہ بیمار کیوں نہ پڑ گیا! ۔ اب اسے برکت اہل کراچی کے اخلاص کی سمجھیے یا شہر کی سمندری آب و ہوا کی یاد رکھیے ۔۔۔ پھر اس بے اندازہ التفات و کرم کے ساتھ توقعات اس مشت خاک سے کس تعداد اور کس کس قسم کی قائم :

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ ۔۔۔ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں!

مرحومین میں سب سے مقدم حاضری مزار سلیمانی پر تھی۔ پہلے اُن مرحوم کے گھر گیا۔ اس مقام کو حسرت کی آنکھوں سے دیکھا جہاں اس مؤرخ اسلام اور فاضل جلیل نے ناسوتی زندگی کے آخری لمحہ گزارے تھے۔ جہاں بیمار پڑے تھے، جہاں جان کا تحفہ جان آفریں کو واپس کیا تھا۔ صاحبزادہ میاں سلمان سلمہٗ کا شمار تو خیر ابھی بچوں ہی میں ہے، البتہ سید صاحب کے بھتیجے اور بڑے داماد سید ابو عاصم ایڈوکیٹ سے مل کر جی خوش ہوگیا۔ ماشاء اللہ خوب پڑھے لکھے نکلے۔ اردو انگریزی دونوں میں برق۔ قدرت لکھنے پر بھی اور بولنے پر بھی اور پھر جتنے پڑھے ہوئے اتنے ہی گڑھے ہوئے بھی۔ مہذب، شائستہ، متعلیق، مشرقی اور اسلامی رنگ کے

ادب شناس، ان کی بیوی (دختر نیک اختر حضرت سلیمان ندوی مرحوم) بسری گردوں کی کھائی ہوئی ہے۔ بچپن میں بڑی پیاری تھی ــــ گھر کے بعد مزار پر حاضری ہوئی گھر سے چند ہی فرلانگ پر ہے کچی تربت[1] کا دل پر بڑا ہی اثر ہوا، ہٹنے کو جی نہ چاہا۔ دھوپ کا وقت نہ ہوتا اور ساتھیوں کے سبب عجلت نہ ہوتی تو جی میں تھا کہ لحد کے کنارے بیٹھ جایئے اور زبان بے زبانی میں کچھ اپنی سنایئے اور کچھ اُدھر سے سُنیئے تو زاہانیت اس سیرت نگار نبوت کے مرقد پر نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی! ایک معمولی کچی تربت، بغیر کسی قسم کی بھی آرائش و تکلف کے عبدیت کی پوری مظہر، سیسوں پختہ و شاندار اور پر تکلف مزارات پر بھاری، غالب نے ایک دوسری لیکن اسی مقام و مرتبہ سے ملتی ہوئی کیفیت کی عکاسی کیا خوب کی ہے

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

سید مرحوم آج زندہ ہوتے تو ملاقات کا کیا رنگ ہوتا! کتنے سوال و جواب ہوتے کیسے کیسے عقدے حل ہوتے۔ کیا کیا لطیفے سننے میں آتے عرض و معروض، گلے شکوے، راز و نیاز، سب ہی کچھ رہتے اور شاید کچھ نوک جھونک بھی چل جاتی! اب یہ سب کیا جنت ہی کے لئے اُٹھ رہا؟ بشرطیکہ وہاں اُس بڑے کے ساتھ اس چھوٹے کو بھی جگہ مل گئی! ــ مرحوم کا ارادہ آخر وقت تک ہندوستان چھوڑنے کا نہ تھا۔ صرف عارضی پرمٹ پر چند روز کے لئے پاکستان آئے تھے۔ واقعات و حوادث تکوینی کس کے بس کے ہیں۔ پے در پے ایسے پیش آتے چلے گئے کہ بات روز بروز بگڑتی چلی گئی اور مرحوم کو گویا اضطراراً ہندوستانی سے پاکستانی بن جانا پڑا۔

---

(۱) ان سطور کی تحریر کے وقت اطلاع ملی کہ قبر پختہ بن گئی ہے۔

بات ذرا الگ سی ہوئی جاتی ہے لیکن سید صاحبؒ کے ذکرِ خیر کے ذیل ہی میں ایک جملہ معترضہ بے اختیار زبانِ قلم پر آئے جاتا ہے۔ ان کے ایک مرید باختصاص ہیں غلام محمد (عثمانیہ) دکھنی ثم کراچوی۔ تلمذ کے اعتبار سے ندوی اور وضع و شکل کے لحاظ سے دیوبندی۔ مولانا گیلانی کے شاگرد، بہادر یار جنگ کے شیفتہ و معتقد اور سید صاحب کے مخلص مسترشد۔ اسٹیشن پر ملے تھے۔ اور یہاں بھی گھر پر اور مزار پر ساتھ ساتھ جب تک اپنا قیام کراچی میں رہا۔ بار بار ملتے رہتے اور اپنی فہم سلیم کا ثبوت دیتے رہے۔ رخصت کرنے جب اسٹیشن آئے تو ایک لذیذ نفیس قسم کے حلوے کی ایک اچاری ساتھ کر گئے۔

سید صاحب سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر اللہ کا ایک اور شبیر خواب ابدی کے مزے لے رہا ہے! علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ مفسر، محدث، متکلم یہ حضرت بھی اپنے تصدے تو ہندوستان سے ٹلنے والے نہ تھے تقدیر الٰہی کی حکمتیں اور تکوینیاتی مصلحتیں کس کی سمجھ میں آسکی ہیں۔ چند روز کے ارادہ سے کراچی گئے اور واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے، ارادے کرتے رہے اور یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ کا ارادہ سب پر غالب رہا۔ مزار پختہ، بلند اور خاصہ پُر تکلف تھا، معتقدین کا جوشِ عقیدت بغیر اس کے مانتا کب ہے۔ پھر بھی صاحبِ قبر کی عظمت کی تجلیات غیر مخفی نہیں ـــــ احادیث میں تو ممانعت قبور کی پختگی بلندی اور تعمیر قبہ کی آئی ہے۔ اس سے قطع نظر ذوق و وجدان کو جو کشش سادہ خام تربت میں معلوم ہوتی ہے وہ بڑے بڑے گنبدوں والے مزارات میں نہیں ملتی۔ لیکن بشر کا بیچ، مشرکانہ مذاق بار بار اسے اسی طرف لوٹا کر لے جاتا ہے۔

اسی سرزمین پر اپنے بعض عزیز بھی آسودۂ خواب ہیں۔ ان میں نمبر اول پر نام پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل محمد وسیم مرحوم کا آتا ہے، دیکھنے میں "مسٹر" تھے لیکن اپنی سیرت، عادات

واطوار کے لحاظ سے بہت سے مولوی صاحبان اور دینداروں سے بڑھ کر دیندار۔ لکھنؤ میں ایک بڑے کامیاب اور نامور بیرسٹر تھے، سب کچھ لٹا کر اسلام اور پاکستان کی محبت میں پاکستان آ گئے یہاں ہاتھوں ہاتھ ایڈووکیٹ جنرل کے سہارے پر لئے لئے گئے۔ مروت، شرافت، دیانت اور فیاضی کے گویا پتلے تھے۔ خدا جانے کتنوں کے رزق کا ذریعہ اللہ نے انھیں کو بنایا تھا اور قرض دے کر اسے واپس لینا تو جانتے ہی نہ تھے۔ قرضدار بیچارہ ہے کہ رقم شکریہ کے ساتھ واپس لایا ہے لیکن یہ واپس لیتے کب ہیں۔ شدید انکار کئے جا رہے ہیں۔ نماز کیا معنی صبح کی تلاوت تک کے شدت سے پابند۔ یہاں کے ایک بڑے جنگلی قبرستان میں کسی پرانے بزرگ کے مزار کے حلقہ میں مدفون ہیں اور ان کے مزار پر آیات قرآنی کا جو کتبہ لگا ہوا ہے وہ بھی بڑا موثر ہے۔ وقت دوپہر کے قریب ہو چکا تھا جب ان کے صاحبزادہ، صاحبزادی اور بیگم کو لے کر ان کی قبر پر پہنچا۔ جی لگا اور دیر تک ہٹنے کو جی نہ چاہا ——— انھیں کے متصل دو اور عزیز چودھری سعید الزماں اور چودھری مشفق الزماں بھی اس پردیس میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور ان کی ضعیف و ناتواں والدہ ڈیڑھ ہزار میل دور لکھنؤ میں اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہیں۔

کراچی شہر میں جہاں تک نماز کا تعلق ہے اسلامیت ایسی ہی نظر آئی جیسی لاہور میں تھی۔ آٹھ دن کے عرصہ میں نمازیں متعدد مسجدوں میں پڑھنے کا اتفاق ہوا مسجدیں کثرت سے ہیں۔ اور سب آباد پائیں۔ نمازیوں کے لئے مسجدوں میں انتظامات بھی کچھ اسی طرح کے ملے جیسے کبھی حیدرآباد دکن میں دیکھنے میں آتے تھے۔

ایک دن جب نشری تقریر[1] کے لئے مرکزی ریڈیو گھر جانے کا اتفاق ہوا تو اندر کے

---

(۱) یہ نشری تقریر ضمیمہ نمبر (۱) میں ملاحظہ فرمائیے

صدر دروازہ پر جلی حروف میں وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا[1] دیکھنے میں آیا اور پھر آیۂ کریمہ کا یہی ٹکڑا ریڈیو گھر کے کاغذات پر چھپا ہوا ملا۔ ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے اور ریلوے پلیٹ فارموں پر سمتِ قبلہ کی نشان دہی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ سب شہادتیں تھیں اس کی کہ ایک مسلم مملکت کتنی ہی غافل و بے عمل سہی بہرحال مسلم حکومت ہوتی ہے قدر کے قابل۔

اسلامیت ایک بار پھر عرض ہے کہ تعصب کے مرادف ہرگز نہیں۔ کراچی میں غیر مسلموں کے نام کی سڑکیں (مثلاً گیدول روڈ) اور باغ اور عمارتیں (مثلاً گاندھی گارڈن) سب بدستور قائم ہیں۔ اور سننے میں آیا کہ مجوسیوں (پارسیوں) کی آبادی بھی شہر کے بعض حصوں میں اسی طرح قائم ہے۔ اسلام۔ تعلیم، عدل کی دنیا ہے اور تعصب عدل کے ساتھ جمع ہو نہیں سکتا

---

(۱) اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

(۱۰)
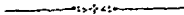
کراچی نمبر (۳)

زہر اور اس کا تریاق

کراچی آئے ہوئے دو ہی تین گزرے تھے کہ وزیر اطلاعات آنریبل سردار ممتاز علی خاں صاحب کے ہاں سے دعوت پہنچی کہ سہ پہر کو وزارت اطلاعات میں چاء ہو۔ اور مقامی اُردو اخبارات کے اڈیٹر صاحبان سے ملاقات کرو۔ تعمیل ارشاد کی۔ دیکھا تو مقامی صحافت کے نورتن جمع ہیں۔ یہ اڈیٹر صاحب "جنگ" ہیں۔ یہ اڈیٹر صاحب "انجام"! یہ اڈیٹر صاحب "ملت" (گجراتی) اور یہ پاکستان نیوز سروس کے چیف اڈیٹر عبدالحفیظ صاحب۔ ان سب کے علاوہ انگریزی روزنامہ پاکستان اسٹینڈرڈ کے اڈیٹر سید فرید جعفری۔ خود وزیر صاحب بہ صوبت تو موجود ہوتے ہی اور ان کے سوا ان کے محکمہ کے جائنٹ سکریٹری سید ہاشم رضا جو اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں اور اس وقت بھی ساری محفل پر دہی چھائے ہوئے تھے۔ کُل دس بارہ ارباب صحافت۔ گویا ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس!

گھنٹہ سوا گھنٹہ اچھی پُرلطف، دلچسپ و پرخلوص صحبت رہی۔ تخلیہ میں پورا موقع حاصل تھا کہ ہندوستان کے خلاف دل کھول کر کہہ سُن لیا جاتا۔ لیکن نہیں، ایسی کوئی بات نہ ہوئی گفتگو کا خاصہ بڑا حصہ "صدق" کی داد تحسین یا یوں کہیے کہ ہمت افزائی میں تھا متعدد صاحبوں کا فرمانا یہ تھا کہ صدق کا ایک ایڈیشن پاکستان میں بھی نکلنا چاہیے۔ اور ایک صاحب نے تو یہ بھی فرما دیا کہ یہ دوسرا ایڈیشن انگریزی میں ہوا کرے! گجراتی اخبار کے اڈیٹر صاحب صدق کے خاص

مخلصوں اور صدق نوازوں میں نکلے اور رفیق جعفری صاحب اور عبدالحفیظ صاحب بھی خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ دوسرے صاحبوں کی نشست ذرا فاصلہ پر تھی۔ ورنہ یقین ہے کہ ان سے بھی شرف مکالمت اسی طرح حاصل رہتا۔ لاہور کی زندہ دلی کے مقابلہ میں یہاں سنجیدگی زیادہ دیکھنے میں آئی اور وہ قہقہے وہ چہچہے وہ ہو حق یہاں دیکھنے میں نہ آیا جو شاید لاہوری صحافیوں کی امتیازی خصوصیت تھا ـــــ آنریبل وزیر صاحب اطلاعات و نشریات دو ہی روز قبل ایک شام کو گورنر جنرل ہاؤس میں خود ہی بڑھ کر مل چکے تھے۔ ان کے مزاج کی سادگی اس روز بھی نمایاں تھی اور آج دوسری ملاقات تو اور مفصل تھی۔ افسرانہ شان اور حاکمانہ تمکنت کے بجائے خدمت خلق کا جذبہ ان پر غالب معلوم ہوا اور خدا کرے کہ یہ سرسری اندازہ صحیح اور مطابق واقع ہو۔ اور سید ہاشم رضا تو اسی طرح ملے کہ جیسے کوئی عزیز قریب ملتا ہے۔ ان کے بھائیوں اور بزرگوں (سید محمد رضا مرحوم جج چیف کورٹ اودھ، سید آل رضا، رضا، غیرہم) سے تعلقات بیشک رہے بھی ایسے ہی گہرے ہیں۔ اور یہ ان کی شرافت ہے کہ ان کو انھوں نے یوں نباہا ـــــ اسی جلسہ میں حکم ملا کہ دو ہی چار روز کے اندر کراچی ریڈیو سے تقریر[1] کرنا ہو گی۔ میں حیران کہ ادھر یہاں کی ہمہ وقتی مصروفیت میں تقریر تیار کیوں کر ہو سکے گی۔ اور ادھر خود محکمۂ نشریات اپنے قاعدے ضابطے توڑ تاڑ دو ہی چار دن کے اندر اس کے لئے گنجائش کیسے نکال لے گا!

کراچی کے اداروں میں شہرت "اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف مثل ہائجین" کی مدت سے کان میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک بین الاقوامی اور عالمی ادارہ "مثل ہیلتھ و رلڈ فیڈریشن"۔ (یہ عالمی

---

(۱) ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر (۱)

ادارۂ صحت دماغی) کے نام سے یورپ اور امریکہ میں مدت سے قائم ہے۔ مرکز لندن ہے اور شاخیں اطراف عالم میں پھیلی ہوئی۔ رسالے بھی انجمن مذکور کی طرف سے نکلتے رہتے ہیں۔ اور سالانہ رپورٹیں وغیرہ بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور مطبوعات ادارہ کا موضوع محض نفسی تفسیاتی نہیں، اخلاقی و اخلاقیاتی بھی ہے۔ کراچی کے ان اہل علم مومنین صادقین کی یہ جدت قابل داد ہے کہ انھوں نے اس ناطرفدار اور غیر جانبدار قسم کی علمی انجمن میں اسلامیت کا پیوند لگا کر اسے ایک علمی دینی انجمن بنادیا اور اس کا نام اپنے ہاں "اسلامک انسٹی ٹوٹ آف منٹل ہائجین" رکھ دیا۔ کرنل ڈاکٹر شاہ اس کے روح رواں ہیں اور خاں بہادر صدر بھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک جوان عمر مسترشد مختار احمد خاں ایم۔ اے (علیگ) ہیں۔ جو ایک عرصہ تک صوفیانہ و دینی ماہنامہ "مستقبل" بھی نکالتے رہے اور شاید اب بھی نکال رہے ہیں۔ وہ آئے اور بار بار ملے اور وہی دعوت دے کر ادارہ مذکور کے جلسہ میں لے گئے۔ کرنل شاہ کے علاوہ اور بھی دو چار صاحب علم موجود تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر محمود حسن (علیگ) رفعت احمد خاں ایم۔ اے غلام محمد بی۔ اے (عثمانیہ) وغیرہ، زاہد حسین صاحب گورنر اسٹیٹ بینک کسی معذوری سے نہ آسکے ورنہ سُنا کہ وہ اس میں خاصی دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ اس روز مذاکرہ زیادہ تر ڈاکٹر شاہ خود ہی کرتے رہے۔ قرآن مجید کی آیت تعدد ازدواج والی زیر بحث تھی اور ایک صاحب شیخ محمد عبدہٗ مصری کا حوالہ دے کر تجدد کے اثر سے آیت کے معنی بالکل توڑ مروڑ کر نکالتے رہے۔ ڈاکٹر شاہ اور رفعت احمد خاں کی گفتگو بڑی معقول اور سلجھی ہوئی رہی ــــ ۴۰، ۴۵ منٹ کی شرکت سے طبیعت نے بہت اچھا اثر قبول کیا۔ کاش اس کی ممبری کا دائرہ اور وسیع ہوتا۔ اور اس میں انگریزی خواں خصوصاً حکام کا طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوتا۔ پاکستان کی سرزمین گو دینی اعتبار سے "شر انگیز" اور "فتنہ پرور" سمجھی جائے۔ لیکن یہ بھی تو فطرت کا ایک قانون ہے کہ

جہاں زہر ہوتا ہے اس کے تریاق کی پیدائش بھی اسی علاقہ سے ہوتی ہے اور جہاں [illegible]
پھیلاتے ہیں اس کی دوا بھی اسی سرزمین سے اُگاتے ہیں۔ تجدد اور اس سے بڑھ کر تشکیک
دار تیاب کے مریضوں کے لئے ایسا ادارہ اچھے خاصہ شفاخانہ کا کام دے سکتا ہے۔ پُرانے
قسم کے علماء اس قسم کے اداروں کی افادیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ان کی پوری
قدر و قیمت پہچان سکتے ہیں۔ ان کی اہمیت کے اندازہ کے لئے نظر بھی کسی شبیر احمد عثمانیؒ
اور کسی سید سلیمان ندوی کی ہونا چاہیے۔

دینی اور اصلاحی خدمت کے لئے مصیبت یہ ہے کہ صرف چند ٹھپے مخصوص سمجھ لئے
گئے ہیں اور یہ بات دلوں میں بیٹھ گئی ہے کہ ان محدود ٹھپوں سے باہر کوئی کام انجام ہی نہیں یا
جا سکتا ہے۔ غلط فہمی اور تقلید جامد کے اس طلسم کو ندوہ نے ایک حد تک توڑا تھا لیکن خود ندوہ
ہی کی کامیابی محدود رہی اور ذہنوں سے اب تک یہ وہم پوری طرح دور نہ ہو سکا کہ "دینداری"
نام محض ایک مخصوص وضع و لباس اور ظاہر کی چند پابندیوں کا ہے۔ حالانکہ دنیا صحیح یا غلط
بہر حال ایسی منزل پر پہونچ چکی ہے۔ اس کے لئے اب وہ پُرانے حربے بڑی حد تک
کند اور بے کار ہو چکے ہیں۔ اور اب حقائق سے آنکھیں بند کر کے انھیں پر انھیں متبرک و
مقدس سمجھ کر تکیہ کئے رہنا ایسا ہی ہے جیسے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم والے میدان جنگ میں
استعمال صرف تیر و تبر، تلوار اور نیزہ کو جائز سمجھا جائے اور دلیل یہ پیش ہوتی رہے کہ ہمارے
"اسلاف صالحین" نے فتحمندیاں صرف انھیں آلات سے حاصل کی تھیں اور ملکوں اور اقلیموں
کی تسخیر میں کام انھیں اسلحہ سے لیا تھا! ——— مخالفین، و معاندین صرف کمزور اور روایتدار
پہلوؤں کو چن لیتے ہیں اور روشن پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں، پاکستان کی بھی بدبختی کا

یہ دیکھ کر اچھا ہوا کہ اپنوں اور کچھ بیگانوں دونوں کی مہربانی سے ایسا بے پناہ اور لاہوری صحافت کی زبان میں "البرز شکن" ہوا ہے کہ باہر بیٹھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ لاہور، اور کراچی میں نمازیوں کی جماعتیں دیکھنے میں آئیں گی مسجدیں آباد ملیں گی، کچھ تھوڑی بہت عورتیں بھی پردہ نشین اور برقع پوش دکھائی دیں گی، اور چند حکام بھی نشہ اور نشۂ الحاد سے محفوظ ملیں گے۔ مشاہدہ نے اس دہشت انگیز اور مایوس کن صورت حال کا اچھا خاصہ مبالغہ آمیز ہونا واضح کر دیا۔ نمازیوں کی تعداد ماشاءاللہ اب بھی بڑی ہے۔ مسجدیں خاصی آباد ہیں۔ بیویاں اور بیٹیاں بھی سب کی سب باہر نکل نہیں آئی ہیں۔ اور جہاں ایک طرف الحاد یا مادیت کو فروغ ہو رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف اصلاحی، تعمیری، دینی، ادارے بھی مفقود و معدوم نہیں ہو گئے ہیں۔ ہاں کم ہیں اور کمزور ہیں۔ ضرورت انھیں قوت پہنچانے اور ان کے وسیع کرنے کی ہے۔ اور انھیں میں ایک مرکزی ادارہ یہ "اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل ہائجین" ہے۔

بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ قدیم و جدید گروہوں میں بیگانگی اچھی خاصی پیدا ہو گئی ہے گویا دینداروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور جب باہمی بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں تو یہ نتیجہ بھی بالکل قدرتی ہے کہ ایک فریق کی سیدھی سی بات بھی دوسرے کو تیر و نشتر ہو کر لگتی ہے۔ اور علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان بے اعتباری کا یہ زور ہے کہ یہ اگر دو اور دو کو چار کہیں، تو وہ ان کی ضد میں آکر اس بدیہی حقیقت کو کہیں جھٹلا دیں! اور اقبال کی یہ شاعری کچھ حقیقت سی بن گئی ہے ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے!

نرم کے اندر مال اور رپورٹ کے التیام کا کام "ندوہ" ہی کی قسم کی کوئی جماعت انجام

دے سکتی ہے، جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم ہو اور شکل وقالب کے لحاظ سے جدید صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پُرانا۔ جب تک کوئی نادرۂ جدید میدان عمل میں آئے۔ اس قسم کے ادارے اس کی جانشینی خاصی حد تک کر سکتے ہیں

(۱۱)

کراچی نمبر (۴)

خوشگوار تجربے

اسی قسم کے مفید ادارے یہاں اور بھی ہیں۔ ایک روز جب کہ قیام کراچی میں شاید ایک ہی دن کی مدت باقی رہ گئی تھی۔ ایک صاحب ڈاکٹر بلگرامی نامی ملنے آئے غالباً لندن کے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں اردو کے معلم رہ چکے ہیں۔ اور اب شعبۂ تعلیمات میں کسی اچھے عہدہ پر ہیں، اپنے کسی تعلیمی ادارہ کی تفصیلات کا ذکر کیا جو اب ذہن میں محفوظ نہیں، لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ادارہ عملاً اچھا خاصہ دینی بن گیا تھا۔ سُن کر جانے اور اسے دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا۔ وقت میں گنجائش نہ نکل سکی۔ اور اس کا افسوس رہا ـــــ مولانا محمد علی کی یادگار ایک محمد علی میموریل سوسائٹی جیل روڈ پر قائم ہے اس کے نوجوان مستعد سکریٹری اور کارکن اسٹیشن پر مل گئے۔ پھر گھر پر آئے اور اپنی سوسائٹی کے لئے کچھ لکھا کر لے گئے۔ سوسائٹی کام جو کچھ بھی کر رہی ہو۔ بہر حال انتساب تو محمد علی کے نام سے رکھتی ہے ـــــ مسلمانوں کے بڑے بڑے تجارتی کاروبار اور صنعتی کارخانے شہر میں خدا معلوم کتنے ہوں گے۔ اپنے جانے کا اتفاق صرف دو جگہ ہوا۔ اور دونوں جگہ جا کر جی خوش ہی رہا۔ ایک تو حافظ ٹکسٹائل مل جو شہر کے ایک کنارے حرفتی رقبہ میں اپنے ہی ضلع بارہ بنکی کے ایک نابینا صاحب کی قائم کی ہوئی ہے۔ کارخانہ کی وسعت، مشینوں کی کثرت، کارکنوں کی تعداد دیکھ کر آنکھیں کھُل گئیں۔ مالک بیچارہ علاوہ نابینا ہونے کے اَن پڑھ سے ہیں۔

لیکن اللہ نے وہ برکت دے رکھی ہے کہ بس حیرت ہی ہوتی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ ثمرہ اخلاص نیت، تواضع وجذبۂ خدمت کا ہو۔ دوسرا بڑا کاروبار کمپنی کی شکل میں پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کا دیکھنے میں آیا۔ دفتر کی وسعت، صفائی وغیرہ سب (اگر یہ کمپنیوں کی سی نظر آئی)۔ اور یہ یقین مشکل ہی سے آیا کہ ایسی خوش انتظامی کبھی کسی مسلم کاروبار کے بھی حصہ میں آ سکتی ہے چار جہاز اس وقت کمپنی کے پاس موجود ہیں سفینۂ عرب، وغیرہ اور ماشاء اللہ کام ترقی پر ہے۔ بحری تجارت ایک زمانہ میں مسلمانوں کی خاص چیز تھی اور بڑی بابرکت تجارت ہے۔ کلکتہ، بمبئی، اور کراچی وچاٹگام کے مسلمان تاجر اگر ہمت سے کام لیں تو ہندوستان و پاکستان دونوں میں ایک نہیں متعدد بحری کمپنیاں قائم کر سکتے ہیں

شہر میں ایک اونچا نیم سیاسی ادارہ انڈو پاکستان فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کے نام سے ہے۔ مقصد وموضوع نام سے ظاہر ہے۔ اسی قسم کا ایک ادارہ کئی سال ہوئے دہلی میں قائم ہوا تھا۔ اب غالباً الٹ گیا ہے۔ مدت سے خبر معلوم نہیں ہوئی۔ بہرحال کراچی کا یہ ادارہ زندہ وفعّال ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ حسب الحکم انجمن مذکور مجھ غریب کو ایٹ ہوم دے رہی ہے۔ چھپے ہوئے کارڈ انگریزی میں کثرت سے تقسیم ہوئے۔ سہ پہر کو پہنچا، عمارت عالی شان بیچ لگژری ہوٹل (Beach Luxury Hotel) کی تھی جس کا شمار دارالسلطنت کے اعلیٰ ہوٹلوں میں ہے۔ الگ الگ میزوں پر مجمع کوئی سو، سوا سو کا تھا۔ میرے لیے وسط ایک الگ میز اور صوفہ مع میکری فون کے۔ میں نے میکری فون ہٹوا دیا کہ بجائے "تقریر" کرنے کے فرداً فرداً ہر میز پر چل کر گفتگو کر لوں گا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آئے اور آتے ہی انجمن کی سکریٹری کو آڑے ہاتھوں لیا کہ کارڈ بجائے اردو کے انگریزی میں؟ ایم، بی احمد صاحب

آئی سی، ایس۔ پہلے علیگڑھ میں سیشن جج تھے اور اب یہاں غالباً مجلس وضع قوانین کے سکریٹری ہیں اور انگریزی کتاب "اسلامی ہند میں معدلت گستری" کے مصنف۔ مدت کے بعد ان سے یہیں ملاقات ہوئی، اکل و شرب کے بعد سکریٹری صاحب کے ساتھ ہر ہر میز پر گھوما۔ عام طور پر گفتگوئیں اچھی رہیں۔ ایک میز پر افغانستان کے خلاف جوش بہت زیادہ تھا۔ مجھ سے سوال ہوا کہ "ابھی آپ افغانستان کے خلاف جہاد کا فتویٰ نہ دیں گے؟ عرض کیا کہ میں رائے تو ہندوستان کے خلاف بھی جہاد کی آپ کو نہیں دیتا۔ چہ جائیکہ افغانستان جو بہرحال ایک مسلم ہمسایہ ہے"۔ ———— ایک اور میز پر اسی سرگرمی سے اظہار خیال از علّم محمد علی کے تقدس کے خلاف ہو رہا تھا۔ ایک صاحب گرما گرم ہو کر بولے کہ "ایسی بے ضرورت شادی شرعاً جائز کیسے ہو سکتی ہے۔ عرض کیا گیا ضرورت کا فیصلہ تو خود صاحب ضرورت ہی کر سکتا ہے۔ دوسرا اس میں دخل دینے والا کون؟" ———— یہیں ایک اور میز پر ماہر القادری صاحب (ایڈیٹر فاران) دکھائی دیئے۔ جماعت اسلامی میں شریک ہونے سے قبل ناداری و مہرباں رہ چکے ہیں۔ تعارف ہوا لیکن قبل اس کے کہ ایک بات بھی ہو سکریٹری صاحب کچھ ایسی جلدی میں تھے کہ مجھ کو دوسری میز پر لے گئے اور یہیں تعارف خواجہ جمیل احمد سے ہوا جو سلسلہ نوں پر ادبی و ثقافتی پہلو سے اچھے اچھے مضمون انگریزی میں لکھتے رہتے ہیں۔ اور یہاں غالباً محکمہ اطلاعات میں کسی اچھے عہدہ پر ہیں۔

رخصت ہوتے وقت کسی صاحب نے فوٹو لینا چاہا، میرے عذر کرنے پر رک گئے البتہ دوسرے دن جو انگریزی اخبارات آئے تو دیکھتا کیا ہوں کہ میری تصویر کھینچی کھنچائی موجود ہے اور مجھ سے متصل فرید جعفری صاحب (ایڈیٹر پاکستان اسٹینڈرڈ) بیٹھے ہوئے ہیں! ——— شرعی پہلو سے قطع نظر اپنے کو طبعی ناگواری بھی تصویر کھنچانے سے ہے۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ زمانہ

اتنی ترقی کر گیا ہے کہ صاحب تصویر کی اجازت بلکہ علم کے بغیر ہی کھٹ سے اسکی تصویر اتار لی جاتی ہے۔ اور وہ غریب منہ دیکھتا رہ جاتا ہے!

کراچی میں اپنے عزیزوں وطن دیوار وطن والوں کی کوئی کمی نہیں، ملاقات اکثر سے ہوگئی۔ اور بعض سے تو تقسیم ملک کے بعد پہلی ہی بار ملنا ہوا۔ بیگم وسیم مرحوم بیگم چودھری خلیق الزماں (چودھری صاحب تو انڈونیشیا میں تھے اور ان کی بڑی بیگم لاڑکانہ میں رہتی ہیں) چودھری اکبر حسین (ریٹائرڈ جج الہ آباد ہائی کورٹ) چودھری محمد اسمٰعیل لکھنوی (نیشنل بینک والے) شیخ صدیق الزماں حیدرآبادی ثم کراچوی عظیم الدین احمد قدوائی (ریڈیو انجینیر) حکیم الدین قدوائی (ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز) وہاج الدین قدوائی (پوسٹ آفس والے) وغیرہ سب عزیزوں سے ملاقات ہوگئی۔ اور اکثر کے ہاں دعوتیں بھی کھائیں۔ سب کے نام نہ اب یاد ہیں اور نہ کوئی جامع فہرست پیش کرنا مقصود ہے۔ انگریزی روزنامہ "ڈان" کے چیف نیوز ایڈیٹر محمد عشیر ایم اے (علیگ) قریبی رشتہ سے بھانجے ہیں کیماڑی میں ان کے والدین بھی انھیں کے ساتھ رہتے ہیں اور بڑی ستھری اور مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میری بیوی گورنر جنرل ہاؤس کی مہمانداریاں چھوڑ انھیں کے ہاں جا کر رہیں اور بہت خوش رہیں۔ مینائی خاندان سے بھی قرابت ہے۔ محمد اسمٰعیل مینائی اچھے عہدہ پر ایک کارپوریشن کے سکریٹری ہیں۔ ان کے بھائی محمد ادریس مینائی پاکستان نیشنل بینک کے غالباً منیجر ہیں۔ اور اسرائیل مینائی اور اسحاق مینائی یہ چاروں بھائی گویا شرافت و انسانیت کی تصویریں ہیں۔ خوب ملے اور بڑی بات یہ کہ ملنے جلنے، کھلانے پلانے سب میں برابر میرے ہر مذاق و مسلک کی پوری رعایت کرتے رہے۔ دوسرے

امیرزادے حسن احمد مینائی اور ان کے والد ماجد محمود احمد مینائی بھی ان سے کچھ کم نہ تھے
کراچی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر شیخ غلام قادر فرید سے بھی سلسلۂ قرابت کا ملتا ہے، اپنے
لطف و کرم سے ملنے آئے اور ایک نشری تقریر جو حسب الحکم مجھ سے کرائی اُس میں پابندیوں
کے بجائے ہر طرح مجھے آزادی دے رکھی۔ ایک عزیز قریب (توکل کریم) قی۔ کے قدوائی
بحریہ میں لفٹننٹ کمانڈر ہیں اور کیماڑی سے متصل چھوٹے سے جزیرہ منورا میں رہتے ہیں۔
انھوں نے کشتی پر منورا تک کی خوب سیر کرائی۔ ان کے والد مولوی تجمل کریم قدوائی لاڑکانہ میں
وکیل ہیں، وہ وہاں سے ملنے کو آئے ــــــ وطنی عزیزوں میں ایک حکیم چودھری سراج احمد
تھے۔ بارہ بنکی میں مسلم لیگ کے بڑے پُرجوش کارکن جیل بھی اسی سلسلہ میں بھگتے ہوئے۔ یہاں
بھی چودھری خلیق الزماں کی لانڈری۔ کے زمانہ میں بہت پیش پیش رہے اب بھی ویسے تعلقات
سابق اور موجودہ لیڈروں سے رکھتے ہیں۔ کئی سال کے بعد ان سے ملنا ہوا۔ ایک اور ہم وطن
خواجہ علی امان صدر میں وکٹوریہ روڈ پر چائے خانہ دریاباد کے نام سے پینے پلانے کی دکان
کھولے ہوئے ہیں اور اب ماشاء اللہ لالوکھیت میں اپنا ذاتی پختہ مکان بھی بنوالیا ہے
وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ جوار وطن کے ایک صاحب اور ہمنام عبدالماجد رسولوی
کمیشن ایجنٹ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف صدق کی خدمت بڑی عالی ہمتی سے اور میرے
اندازے سے کہیں بڑھ کر کی۔ بلکہ ذاتی طور پر بھی سے ضبط اوقات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے
مسرت اسٹیشن ہی پر دو تین بار ملے۔ اور دوسری بار مع ایک بھاری ناشتہ دان کے۔
اخلاص کے ساتھ دولت فہم سے بھی بہرہ ور کم ہی لوگ ملتے ہیں۔

بیان کچھ خانگی یا گھریلو قسم کا ہو چلا۔ او سفرنامہ پر حق جتنا اندرونی کا ہے

اس سے کہیں بڑھ کر باہر والوں کا ہے ـــــ مشاہیر کراچی میں نمبر اوّل بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق کا ہے۔ ان سے ایک ملاقات مفصل اور دو سرسری رہیں۔ انکی انجمن کے کتب خانہ کو بھی سرسری نظر سے دیکھا۔ عجب جوان ہمت، یہ پیر مرد بھی ہیں، قویٰ (بجز قوت سماعت کے) اس سن و سال کے دیکھتے ہوئے ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ اور ہمت و مستعدی تو قابل رشک ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ ملا واحدی دہلوی (ایڈیٹر نظام المشائخ) اور رازق الخیری (ایڈیٹر عصمت) کو سالہا سال بعد دیکھا اور سن کے اثر سے قدرۃً متأثر پایا۔ دونوں کے گھر پر بھی حاضری دی۔ ملا واحدی اپنے محدود رنگ میں خاموشی کے ساتھ دین و ادب کی خدمت کئے جا رہے ہیں اور عصمت کا موجودہ معیار بھی "اپوا" (A.P.W.A)[1] کے دور میں برقرار رہ جانا بس رازق الخیری صاحب کی ہمت ہی کا کرشمہ ہے۔ فخر ماتری صاحب ایڈیٹر وطن (گجراتی) سے ملاقات ایک ہی بار ہوئی لیکن ان کے اخلاص کا نقش دل پر گہرا رہا، اور ان کے سلسلہ کے اور لوگ بھی اسی اخلاص کو لئے ہوئے ملنے آئے۔ جلیل قدوائی صاحب ایم اے علیگ، سے ایک زمانہ سے خاصہ تعلقات تھے انکی جو ملنا ہوا تو معلوم ہوا کہ درمیانی مدت کتنی ہی طویل ہو۔ اخلاص کے قیام و بقا میں حائل نہیں ہو سکتی یہاں غالباً سینیر انفارمیشن آفیسر ہیں۔ شاعری اور ادبیت کے ساتھ اسلامیت بھی خوب نکھر آئی ہے۔ ضیاء، ای بی کرانی کاکوروی اور رشید احمد رزاقی بانسوی بھی غالباً ایسے ہی عہدہ داروں پر ہیں۔ یہ دونوں بھی خوب ملے۔ سید ہاشم رضا جائنٹ سکریٹری انفارمیشن) اور سید کاظم رضا (سابق انسپکٹر جنرل آف پولس) دونوں بھائی اسی لطف و محبت سے ملے۔ گویا عزیز قریب ہی ہیں۔ کرنل عون جعفری (ریٹائرڈ انسپکٹر جیل) اور نامور ڈاکٹر عبدالصمد کانپوری دونوں سے ایک دعوت میں

(۱) آل پاکستان انجمن خواتین All Pakistan Women Association

ملاقات ہوئی اور دونوں جلد ہی شیر و شکر ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی گہری مذہبیت کے تذکرے جو سُنے تھے ملنے کے بعد وہ مبالغہ آمیز نہیں۔ بلکہ کچھ ہلکے ہی معلوم ہوئے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ الخ۔ حیدرآباد دکن کے سید محی الدین بہاری (سابق پرنسپل اردو کالج کراچی) پُرانے ملنے والوں میں ہیں۔ بڑے نیک شائستہ و دیندار مدت کے بعد اب کی تجدید نیاز ہوئی ان کے ہمراہ ان کے مشہور و معروف بھائی سید تقی الدین بھی تھے "پولیس ایکشن" کے قبل کے ہیرو! انھیں دیکھ کر برابر یہ سوچتا رہا کہ کہیں کامیابی ان کے گروہ کو ہو گئی ہوتی تو آج دکن کیا معنی خود ہندوستان ہی کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی!، ضامن علی گویا بلی بھیتی، تفضل داؤد صاحب ایڈوکیٹ (مصنف "رل شیواجی" انگریزی) حاجی محمد یوسف جلبہ اثر زبیری (مصنف منظوم ترجمہ القرآن) عبد الحی عباسی، نواب شمس الحسن لکھنوی۔ سیفی ندوی، شاہد احمد (ایڈیٹر "ساقی") سید تفضیل احمد جعفری خیرآبادی۔ یحییٰ احمد صابر سندیلوی۔ سرور شاہ گیلانی (ایڈیٹر "الجماعت" سید الحق دیسنوی (نیوز ایڈیٹر پاکستان ریڈیو) شیخ محمد عنایت اللہ صاحب (تاج کمپنی) ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی مولوی حبیب احمد ندوی، حکیم نصیر الدین ندوی اور ان کے نورانی شکل والے والد ماجد۔ یہ سارے نقش اس وقت حافظہ میں سنیمائی تصویروں کی طرح اُبھر رہے ہیں ـــــ اور یقیناً بہت سے چھوٹ بھی گئے ہوں گے۔

گورنر جنرل ہاؤس پہنچ کر دم لیا ہی تھا کہ میزبان یعنی گورنر جنرل بہادر کے پرائیویٹ سکریٹری کے نام انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ (مسلم نوجوانوں کی بین الاقوامی انجمن) کی طرف سے انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا خط پہنچا کہ "مولانا عبدالماجد دریابادی، جیسا کہ ہم کو اخبارات سے معلوم ہوا ہے کراچی آرہے ہیں اور گورنر جنرل بہادر کے مہمان ہو رہے ہیں براہ کرم مولانا سے وقت مقرر کرا دیجیے کہ کسی وقت یوتھ اسمبلی کے مجمع میں خالق دینا ہال میں تقریر کریں۔ وقت ۵ بجے شام کا بہتر ہوگا"۔ —— اخباری شہرت کا برا ہو۔ خدا معلوم کتنوں کو غلط فہمی یہ قائم ہو گئی ہے کہ یہ گوشہ نشین قوم مسلم کا مزدور بھی کوئی پبلک لیڈر قسم کا مخلوق ہے یہ جہاں پہنچے اس کا استقبال زندہ باد کے نعروں سے کیا جائے۔ اس کا جلوس نکالا جائے۔ اسے جلوس میں رگیدا جائے۔ اس کی تقریر پر تالیاں بجائی جائیں۔ اس کی گردن ہاروں اور گجروں سے گرانبار کر دی جائے اور اس کے ساتھ ہر وہ معاملہ کیا جائے جس کی عادی قوم اپنے ہر لیڈر کے لئے ہو چکی ہے! اور پھر چاہے دوسرے ہی دن اس کے لئے جوابی نعرے "مردہ باد" کے لگنے لگیں اور راستے سیاہ جھنڈیاں ہر طرف سے دکھائی جانے لگیں۔ لاہور میں یہی مصیبت رہی اور یہی صورت کراچی میں بھی پیش آتی رہی۔ ہزار انکار اور لاکھ معذرت کیجیے۔ قوم اس کا یقین ہی کب کرتی ہے، یہ حضرات غالباً اسٹیشن پر بھی پہنچے تھے

بہر حال اپنے سکریٹری سے انگریزی میں لکھوا دیا اور فون پر بھی کہلا دیا کہ "مولانا کسی بھی پبلک تقریب میں شرکت سے قطعی معذور ہیں۔ وہ یہاں تمام تر ذاتی اور شخصی حیثیت سے آئے ہیں" معذرت واللہ اعلم قبول بھی ہوئی یا نہیں۔ بہر حال مزید تقاضوں سے نجات رہی تحریری پیام تک معاملہ پھر غنیمت رہتا ہے۔ چنانچہ محمد علی میموریل سوسائٹی والے آئے اور بالآخر اسی پر قناعت کر گئے۔

آئے دو ہی تین دن ہوئے تھے کہ وزیر اعظم بلکہ والیِ مصر کرنل جمال عبدالناصر کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ شاہانہ کر و فر، تزک و احتشام سے آئے اور اسی گورنر جنرل ہاؤس کے ایک حصہ میں مقیم ہوئے۔ رات کو روشنی کی وہ جگمگاہٹ ہوئی کہ ہاؤس ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا۔ اور ذرا مبالغہ سے کام لیجئے تو رات پر دن کا گمان گزرتا تھا۔ اپنا معمول ہر روز دن میں عزیزوں، دوستوں سے ملنے ملانے کے لئے باہر نکل جانے کا تھا۔ شام کے وقت یاد ہوئی کہ یہ عاجز بھی شاہی دعوت (اسٹیٹ ڈنر) میں شریک ہو۔ میں اس وقت کئی میل دور کیماڑی میں عزیزی حشیر کے ہاں تھا۔ بلکہ وہاں بھی کہاں تھا۔ وہاں سے نکل کر عزیزی ٹی، کے قدوائی (لفٹنٹ کمانڈر) کے ساتھ کشتی پر۔ ان کے ستقر جزیرہ منورا کو جا چکا تھا۔ ادھر میری طلبی میں ٹیلیفون کی گھنٹی پر گھنٹی بج رہی تھی، ادھر میں اس سے قطعاً بے خبر سیاحت سمندری میں مصروف، نماز مغرب اسی جزیرہ میں پڑھی۔ اس کے بعد جب بہ اطمینان کیماڑی پہنچا تو سب کو سخت مضطرب پایا، کہ طلبی اتنی دیر سے ہو رہی ہے اور تم غائب! فون پر فون لگاتار آرہے تھے، کہ اتنے میں اسٹاف کے ایک صاحب بہ تلاش گمشدہ میں بنفس نفیس بھی آگئے۔ خیر سرکاری ہی موٹر پر بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ ایک مضطرب کا حال لے۔ ڈی سی نے ہاتھوں ہاتھ

لیا اور کہنا چاہیے کہ کشاں کشاں ڈنر ہال تک پہنچایا غنیمت ہوا کہ ابھی کھانے کے وقت میں کچھ دیر تھی۔ ورنہ حقیر سے حقیر مہمان کی بھی بلا وجہ خیر حاضری پر آئی گئی کسی اے۔ ڈی بسی کے سر ہوتی ۔۔۔ شاہی دعوتوں، ضیافتوں کے ضابطے ہی ہیں کچھ ایسے بے رحم!

میزبان و مہمان سب کی تعداد ملاکر کوئی سو اسو کے قریب ہوگی۔ دونوں سرکاروں کے برآمد ہونے میں کچھ وقفہ تھا۔ اور ہم سب بڑے اور چھوٹے (چھوٹا یہاں میرے سوا اور تھا ہی کون۔ سب بڑے ہی تھے) ایک دوسرے بڑے ہال میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اسٹیٹ ڈنر میں شرکت کا زندگی میں پہلا موقع تھا جگمگاہٹ اور ہر قسم کے تکلفات کی آب و تاب الفاظ میں کیا بیان ہو، چیز دیکھنے کی ہے سننے کی نہیں مختلف گوشوں میں نیزہ بردار سپاہی ایک مخصوص قسم کی وردی میں ملبوس در و دیوار سے پیوستہ اسی طرح بے حس وحرکت کھڑے ہوئے تھے کہ انسان سے کہیں زیادہ پتھر کے نصب شدہ بُت نظر آتے تھے۔ مہمان آپس میں مل جل رہے تھے ہنسی چہل ہو رہا تھا۔ سارے مجمع میں سب سے زیادہ بے جوڑ ان سطور کا راقم ہی تھا اور تماشائی سے کہیں بڑھ کر اس وقت تماشہ بنا ہوا تھا۔ کھدر کی خلافتی ٹوپی، رنگین عبا، بے ہنگم داڑھی۔ اس وضع و قطع کا شخص، زرق برق چست لباس والوں، سوٹ پوشوں کے درمیان اگر ہیولا یا اضحوکہ بن کر نہ رہ جائے تو آخر کیا ہو۔ مہذب و شائستہ لوگ تھے۔ زبان سے کسی نے کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں جتنا بھی ہنس رہے ہوں کم ہے ۔۔۔ ہاں میرے سوا کچھ مستثنیات اور بھی تھے۔ عربی لباس عقال و عبا میں دو بزرگ غالباً سعودی سفیر اور ان کے نائب ہوں اور ایک شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس اور چہرہ پر داڑھی لئے

لئے ہوئے سر محمد ظفر اللہ خاں ــــــ عورتیں نہیں لیڈیاں بہت بڑی تعداد میں تو نہ تھیں کوئی ۲۵ ہوں گی۔ لیکن الحمد للہ کہ سب بے حجاب نہ تھیں۔ بعض اچھے خاصے ساتر لباس میں ملبوس اور اسلامی حیا و شرافت کی لاج رکھے ہوئے تھیں بعض بین بین۔ صرف چار یا پانچ ایسی تھیں جو پوشاک ساتر سے زیادہ عریاں زیب تن کئے ہوئے خاص الخاص فرنگی انداز میں ہنس بول رہی تھیں اور خوش فعلیوں میں مشغول۔

اتنے میں ٹھیک ۷ بجکر ۱ منٹ پر دونوں "سرکار" برآمد ہوئے اور کسی افسر (غالبًا ملٹری سکریٹری) نے پکار کر انگریزی میں وہی کہا جسے شاہی درباروں کے نقیب کسی زمانہ میں "نگاہ روبرو" یا "باادب ہوشیار" سے ادا کرتے تھے۔ اور اب مہمان خاص والیٔ مصر سے سب کا تعارف ایک ایک آدھے آدھے منٹ میں فرداً فرداً کرایا گیا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو کھانے کے میز پر بیٹھنے کی باری آئی۔ ہر مہمان کے لئے الگ الگ کرسی مخصوص ہوتی ہے اور اس کے سامنے میز پر اس کے نام کا کتبہ لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں چھپی ہوئی فہرست مہمانوں کو دیدی جاتی ہے جس سے وہ اپنا نمبر تلاش کر لیتا ہے۔ میں جس کرسی پر تھا اس سے متصل ایک مصری کپتان تھے۔ ان سے انگریزی میں تھوڑی بہت گفتگو رہی، زیادہ مصری اور پاکستانی کھانوں سے متعلق، کھانے زیادہ تر انگریزی اور پاکستانی مذاق کے تھے۔ بریانی، شیرمال، مچھلی، مرغ مسلم اور طرح طرح کے کباب وغیرہ۔ مصری مہمان انھیں بڑے شوق سے کھا رہے تھے۔ میز کے تکلفات کا کہنا ہی کیا۔ آخر شاہی دعوت کی میز تھی لیکن کھانے میں کوئی ممنوع چیز کم سے کم میرے علم میں نہ تھی۔ بعض لوگوں کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ شراب ضرور ہو گی۔ اپنے تجربہ میں تو اس کو بالکل غلط پایا ــــــ انگریزی دعوتوں میں یوں بھی

وقت بہت لیتی ہیں یہ جائیکہ شاہی دعوت! باجا برابر بج رہا تھا۔ برقی شعاعیں ڈال ڈال کر فوٹو پر فوٹو کھینچ رہے تھے۔ اکل و شرب کے ساتھ ساتھ بات چیت کرتے اور بات بات پر قہقہہ لگاتے، رہنا بھی داخل تہذیب ہے! پھر کھانے کے نئے کورس خاصی دیر دیر کے بعد لائے جاتے تھے۔ بغرض خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور طعام کے بعد کلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی تقریر میزبان گورنر جنرل بہادر کی طرف سے ہوئی۔ جوان کے بجائے وزیر اعظم محمد علی صاحب نے انگریزی میں ادا کی۔ تقریر لفظ و طرز ادا کے لحاظ سے بھی خاصی تھی اور بڑی بات یہ کہ اس میں اسلامیت کا اظہار اچھا خاصہ تھا۔ مصر و پاکستان کے درمیان رشتہ اشتراک اسلام ہی کو بتایا تھا، جوابی تقریر مناسب الفاظ میں خود کرنل ناصر نے انگریزی میں کی۔ اور اب مہمان اٹھے۔

ابھی روانگی کا اذن عام نہ ہوا تھا۔ اس لئے برابر والے ہال میں پھر کچھ دیر کے لئے ٹہلنا، بیٹھنا، کھڑے رہنا تھا۔ ایکی شاید نظریں مجھ کھدر پوش پر کچھ اور زیادہ ہی پڑیں۔ پاس سے ایک بلند قامت سوٹ پوش گزرے اور خود ہی اپنا تعارف کرا کے دو چار منٹ گفتگو فرمائی۔ یہ سر ملک فیروز خاں نون۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔ ملک صاحب کا ایک آدھ مرتبہ ساتھ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں رہ چکا تھا۔ لیکن اول تو اس کو بھی ایک زمانہ گزر گیا۔ اور دوسرے اس وقت بھی نوبت کچھ زیادہ شناسائی کی نہ آئی تھی۔ ملک صاحب کے جاتے ہی ایک دوسرے سوٹ پوش بھی تشریف لائے اور اپنا تعارف کرایا۔ یہ آنریبل محمد ایوب کھوڑو صاحب وزیر اعلیٰ سندھ تھے۔ یہ نسبتہً زیادہ التفات سے پیش آئے اور اس وقت کی سرسری ملاقات میں تو اچھے ہی نظر آئے ——— نماز عشاء آج وقت معمول سے ہٹ کر ذرا دیر میں پڑھی، حسب معمول

مختصر سی جماعت کے ساتھ ۔

دعوت کے درمیان اور دعوت کے بعد برابر یہ سوچتا رہا کہ دولت کا استعمال انسان کس بیدردی سے کرتا ہے ۔ امیر و غریب کا فرق تو فطری ہے ۔ اسلام نے اسے مٹایا نہیں، پوری طرح جائز رکھا ہے۔ بعض انبیا سابقین سے قطع نظر خود ہمارے رسول ؐ کے صحابیوں میں تکدستی بھی گزرے ہیں اور فاقہ کش بھی ۔ امیر کو یہ حق ہے کہ اپنی دولت سے فائدہ اٹھائے اور اچھے اچھے کھانے کھائے لیکن اسراف کا سوال بہرحال رکھا ہوا ہے اور اعتدال و توازن بڑی نعمت ہیں ۔ آدمی خود اچھا کھا کر بہتوں کو اس میں شریک کرسکتا ہے اور بہتوں کو اسی طرح کا اچھا یا اس سے کچھ کم اچھا کھلا سکتا ہے ۔ یہ کیا کہ خود تو اتنا اچھا کھالیا کہ اس کی تیاری ہی میں سیکڑوں ہزاروں پھنک گئے اور سیکڑوں ہزاروں بھائی بند ایسے رہ گئے جنھیں ان کھانوں کی خوشبو تک نصیب نہ ہوئی! اس کا نام بشریت نہیں، یہ بشریت کے حدود سے تجاوز کرجانا ہے ۔ ۳۰، ۳۵ سال کی بات ہے ہمارا جہ صاحب محمود آباد مرحوم کے ہاں ایک دعوت بڑی دھوم سے ہوئی تھی (غالبًا ان کے یو۔پی کے ہوم ممبر ہونے پر) اس وقت بھی یہی سوچتا رہا تھا کہ کھانا ناچ کر جتنی مقدار میں جارہا ہے یہ آخر ہوگا کیا ؟ اسی کو اگر تقسیم کردیا جاتا تو دوچار گھر نہیں ۔ ایک آدھ محلہ کے لئے کافی ہوجاتا ۔ اسلام یقینًا راہبوں ، سنیاسیوں اور ترک دنیا کرنے والوں کا مذہب نہیں لیکن دوسری طرف ، مسرفوں اور شکم پرستوں کا بھی مذہب نہیں ۔ کھاؤ اور کھلاؤ، جتنا کھاؤ اتنا کھلاؤ بھی اس تعلیم پر عمل اگر عام ہوجائے تو آج کتنی رنجشوں، کتنی خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہوجائے اور یہ عمل کچھ بھی دشوار نہیں ، فطرت

انسانی کی پکار خود اسی جانب ہے کسی شدید مجاہدہ کی حاجت ہی اس کے لئے نہیں قارون شامت کے مارے کو اہل حق نے جب نصیحت کی تو یہ نہیں کہا کر تو دولت دنیا پر یکسر لات مار دے بلکہ یہ کہا کہ :۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ	دنیا میں جو تیرا حصہ ہے اسے
الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ	بھلا نہ دے اور لوگوں سے احسان کر جس طرح
اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۔	اللہ نے تیرے ساتھ حسن سلوک کیا ہے
(سورۃ القصص ۲۸، رکوع (۸)	تو بھی دوسروں کے ساتھ حسن سلوک
پارہ (۲۰)	کرتا رہ ۔

۱۴

کراچی نمبر (۱۳)

پرانی یادیں نئے نظارے

والیِ مصر کا ایٹ ہوم دوسرے دن سہ پہر کو گورنر سندھ نواب سید افتخار حسین خان والیٔ ممدوٹ کے ہاں تھا۔ کارڈ میرے نام آیا۔ میں حسب دستور سہ پہر کو باہر گیا ہوا تھا۔ رات گئے جب واپس آیا تو دعوت نامہ اپنی میز پر رکھا ہوا پایا۔ گورنر صاحب کو معذرت کا فون کر دیا کہ یہ صورت واقع ہوئی۔ جواب آیا کہ کل سہ پہر کو گورنر صاحب کے ساتھ چائے پیجیے ــــ وقت پر پہنچا اور سرسری نظر سے گورنمنٹ ہاؤس کو دیکھا۔ یہاں کی اصطلاح میں گورنمنٹ ہاؤس لاٹ صاحب کی کوٹھی) اسی کو کہتے ہیں۔ بڑے لاٹ صاحب کی کوٹھی گورنر جنرل ہاؤس کہلاتی ہے۔ اس کی وسعت بے پایاں کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ باقی بجائے خود یہ گورنمنٹ ہاؤس بھی کچھ کم نہیں۔ اے۔ ڈی۔ سی بڑے خوش اخلاق ہنس مکھ نظر آئے میرے سکریٹری سمیت مجھے اُتارا۔ اور کئی کمرے طے کرتے ہوئے بالاخانہ کے ایک ملاقاتی کمرہ میں جا بٹھایا۔ نواب صاحب برآمد ہونے میں چند منٹ کا عرصہ تھا جب تک نماز عصر سے فراغت کر لی۔ اتفاق سے اس حصہ میں سامنے کی طرف کوئی تصویر بھی نہ تھی ــــ ہز ایکسلینسی برآمد ہوئے ایک حسین و خوشنما چہرہ، جسم پر سادہ مشرقی لباس، ملے تو اس انداز سے کہ گویا اجنبی نہیں بلکہ پہلے کے ملاقاتی ہیں اور گویا کوئی اونچے حاکم نہیں۔ برابر کے ملنے جلنے والے ہیں۔ دیر تک روکے رکھا۔ اور گفتگو ہر قسم کی، بے تکلفی سے جاری رکھی اور

جب اٹھنے کی اجازت دی تو اس کا وعدہ لے لیا کہ دوسرے دن شب کو کھانے پر ملاقات ہوگی ـــــ یہ دوسری ملاقات بھی ہوئی ۔ اور رفاقت بہت دیر تک جاری رہی ۔ کھانے پر اور کئی صاحب بھی تھے ۔ علمی ، مذہبی گفتگوئیں خوب آزادی سے ہوتی رہیں یہیں مولانا عبدالحامد بدایونی (صدر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان) بھی مل گئے ۔ ملاقات آٹھ نو سال کے بعد ہوئی ۔ گلے لگاکر محبت کی گرم جوشی سے ملے ۔ ان کے بڑے بھائی مرحوم اپنے وقت کے مشہور خطیب خوش بیان میرے ہم نام مجھ سے بالکل عزیزانہ بلکہ برادرانہ تعلق رکھتے تھے ۔ یہیں بے شان و گمان مولانا جمال میاں سلمہٗ فرنگی محلی سے بھی ملاقات ہوگئی ، یہ اب تک ضابطے کے لحاظ سے ہندستانی بلکہ لکھنوی ہی ۔ لیکن خیر کراچی کے لئے بھی ، نہیں ۔ اور ڈھاکہ کو کہنا چاہیئے کہ ان کا "مستقر ہی ہے" ۔ میں ادھر بھی ہوں میں اُدھر بھی ہوں" کی زندہ و قائل رشک تفسیر ۔ اپنی ذات سے شرافت کے پتلے ۔ یہ جہاں اور جسے مل جائیں سمجھئے کہ اسے بہت کچھ مل گیا ـــــ دو سوا دو گھنٹے کے بعد جب صحبت برخاست ہوئی تو دل نواب صاحب کی دلکش شخصیت سے متعلق بڑا خوشگوار اثر لے کر چلا ۔ گفتگو ، لب و لہجہ ، چہرہ مہرہ کہیں سے بھی نہ تمکنت نہ بناوٹ ۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ صوبہ کے گورنر ہیں ، سادگی و بے تکلفی ہمراہ ہیں ۔ کاش پاکستان کا ہر حاکم اپنی ذاتی خو بو کے لحاظ سے ایسا ہی ہوتا !

کراچی میں بچھڑے ہوئے خدا جانے کہاں کہاں کے اور کب کب کے مل گئے ۔ مولانا شوکت علیؒ کے چشم و چراغ اور محمد علیؒ کے بھتیجے اور داماد زاہد علی کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں ۔ برسوں ہوگئے تھے کہ ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ان کا شمار اپنے عزیزوں میں تھا ۔ ایک دن یک بیک فون آیا کہ میں اس وقت کراچی ہی میں

ہوں، میاں بیوی دونوں۔ اور ہم لوگ شعیب صاحب (سفیر پاکستان برائے عراق) کے بنگلہ میں مقیم ہیں۔" دل باغ باغ ہوگیا پتہ لگاکر اور ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ان کے پاس پہنچا (کراچی میں مکانوں کا پتہ لگالینا آسان نہیں) زاہدہ کے ساتھ ہی زہرا بی بھی ملیں۔ اپنے سن سے کہیں زیادہ بوڑھی۔ یہ مولانا محمد علیؒ کی صاحبزادی اور اب تنہا زندہ صاحبزادی ہیں، کیا ربط و تعلق ان سے ہونا چاہئے تھا اور کیا ہے! حوادث تکوینی پرس کس کا چلا ہے؟ یہیں ان دونوں کے فرزند طارق سلمہٗ سے بھی ملاقات ہوئی تھی اسکو دہلی میں قرح مدک کا مڈ میں دیکھا تھا جب بچہ تھا اور کہاں اب ماشاء اللہ شادی شدہ جوان اور خود صاحب اولاد ہے! ۔۔۔ شوکت مرحوم کے نواسہ خالد شوکت علی سے بھی ملاقات یہیں کراچی میں ہوئی۔ جرنلزم کی ٹریننگ ولایت میں حاصل کرکے اب انگریزی کے صحافی ہیں اور حکومت پاکستان کے پریس اتاشی۔ اب تک غالباً امریکہ وغیرہ میں تھے۔ اب دہلی کے سفارت خانہ پاکستان میں جارہے ہیں۔ گورنر جنرل ہاؤس آکر ملے اور بڑی خوشی یہ معلوم کرکے ہوئی کہ محمد علی مرحوم پر انگریزی میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت زیادہ تر اسی موضوع پر رہی۔ ان کے پرانے ساتھیوں کی پوچھ پاچھ کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی اب اس عالم میں کہاں موجود! ۔۔۔ شعیب صاحب کے بنگلہ پر پہنچکر ان کی اہلیہ گلنار مرحومہ (مولانا کی چھوٹی صاحبزادی) کا تصور آجانا بالکل قدرتی تھا۔ انھیں کمروں میں رہتی سہتی ہوں گی۔ کھانے کی انھی میز پر کھاتی پیتی ہوں گی۔ یہیں کہیں جان دی ہوگی۔ جنازہ یوں اٹھا ہوگا بچیاں یوں شیون و بین کر رہی ہوں گی۔ تصور کہاں کہاں گیا اور تخیل میں نقشے کیسے کیسے بنتے اور بگڑتے رہے۔

۔۔ زاہدہ سلمہٗ قد و قامت و جسامت میں گو اپنے والد ماجد سے کہیں پیچھے ہیں تاہم

چہرے کی مشابہت خصوصاً بات کرتے وقت بالکل ان کی ہو جاتی ہے اور جب بولتے ہیں تو بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہیں شوکت مرحوم بول رہے ہیں۔ باتیں وہ دیر تک کرتے رہے لیکن کان ان کی آواز پر نہیں۔ آنکھیں چہرہ پر جمی رہیں۔ باتیں کچھ یوں ہی سی تھیں۔ کچھ سنیں اور کچھ ان سنی رہ گئیں۔ آنکھیں ان کے چہرہ سے نہ ہٹیں۔ سالہاسال کے بعد چہرہ گویا شوکت مرحوم کا سامنے تھا۔ اور اپنی آنکھیں اس منظر سے متاثر ہو کر بے اختیار ڈبڈبا آئیں۔ زاہد سلمہٗ کا بھی دھیان ادھر گیا یا نہیں، اگر کہیں انھوں نے دیکھ لیا ہو گا تو خدا جانے کیا خیال قائم کیا ہو گا!

ایک روز رات کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ حیدرآباد سندھ سے جوابی تار آیا نواب محمد علی آف تاجپور دراوران کے بھائی کی طرف سے تھا۔ آنے اور ملاقات کی اجازت چاہی تھی۔ جواب لکھوا دیا کہ فلاں دن فلاں وقت آیئے۔ آئے اور اس وقت تک میرے لئے گویا اجنبی ہی تھے۔ ملے تو پیکر خلوص و محبت نکلے، صدق و مدیر صدق کے ساتھ وہ مبالغہ آمیز حُسن ظن کہ العظمۃ للہ مجھے حیرت اس لیے اور بھی کہ صدق کی زبان سندھ کے دیہات میں پوری طرح سمجھ میں کیسے آتی ہو گی۔ آخر میں مجھے تاجپور، مدعو کیا اور یہاں سے وہاں تک موٹر کی سواری کے بھی انتظام پر آمادہ ہو گئے تاکہ میری واپسی کے پروگرام میں خلل نہ پڑے اور میں اپنی طے کی ہوئی ٹرین سے حیدرآباد اسٹیشن سے سوار ہو جاؤں۔ خیر جب اس سے معذوری ظاہر کی گئی۔ تو جھٹ جیب میں سے ایک معقول رقم نکال اسے بطور نذرانہ دعوت پیش کر دیا! واللہ کہ میں اس کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھا دنگ رہ گیا اور اب ایک اچھا خاصا میدان شروع ہوا۔ اِدھر سے انکار۔ اُدھر سے اصرار۔ اِدھر سے یہ عذر کہ میں کوئی پیشہ ور

مولوی مشائخ نہیں جو نذریں قبول کرتا پھرے۔ ادھر سے یہ جواب کہ یہ تم تھا آپ کو تا بچورہ لانے اور دعوت کرنے کے لیے بہر حال نکال ہی چکے تھے۔ کش کش دو ایک منٹ نہیں خاصی دیر تک جاری رہی اور بالآخر فتح انھیں اہل اخلاص کو حاصل رہی ـــــ خیال بھی نہ تھا کہ ہندوستان سے باہر اور ایسے دور دراز علاقوں میں ایسے ایسے مخلص پڑے ہوں گے!

ایسے ہی ایک روز رات کو فون پر ٹرنک کال خاص حیدرآباد سے آیا۔ یہ مولانا گیلانی کے بیٹے محی الدین گیلانی کا تھا جو یہاں کلفوٹمنٹ مجسٹریٹ تھے، تاریخ اور وقت کا تعین ہوا۔ اور وہ مع ایک اور عزیز کے آئے انھیں ان کے بالکل بچپن میں حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا۔ دوبارہ زیارت آج ہوئی۔ قرآن مجید میں ایک بزرگ شخصیت سے متعلق آیا ہے زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ علم کی بڑائی تو مولانا کے حصہ میں جس حد تک آچکی ظاہر ہی ہے لیکن جسم کی بڑائی سے مولانا اپنے زمانۂ شباب میں بھی محروم رہے اس کمی کی تلافی ماشاء اللہ صاحبزادہ کے حصہ میں مقدر تھی ـــــ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کی ایک نئی شرح!

ایک روز صبح معلوم ہوا کہ پاکستان کے مشہور سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ آجکل امریکہ سے آئے ہوئے اور اسی لق و دق گورنر جنرل ہاؤس کے کسی حصہ میں مہمان ہیں۔ انکی قانون دانی کی غیر معمولی شہرت اور یورپ و امریکہ میں اس کا اعتراف سُن کر دل ان سے ملنے کو عرصہ سے چاہ رہا تھا۔ نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ اب یہ موقع خداداد ہاتھ آگیا۔ ان کے ہاں جانے ہی کو تھا کہ خود ان کا فون آگیا کہ میں ملنے آرہا ہوں۔ اِدھر سے مکرر معذرت کرائی کہ آپ زحمت نہ کریں۔ میں خود آیا جاتا ہوں لیکن وہ نہ مانے اور چند منٹ بعد تشریف لے ہی آئے۔ تصویر بارہا کی دیکھی ہوئی تھی۔ اس لئے پہچاننے میں وقت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہی مشرقی چہرہ، وہی چہرہ پر داڑھی۔ گفتگو پہلے تو کچھ ذاتی اور نجی قسم کی رہی۔ مثلاً یہ فرمایا کہ "میں تو آپ سے ملنے کا شوق ۱۹۱۴ء سے رکھتا تھا۔ اسی سال بیرسٹری پاس کرکے ولایت سے آیا تھا۔ پنجاب کے فلاں صاحب قلم نے آپ کے مضامین پڑھ کر آپ سے ملنے کی ہدایت کی تھی" اور پھر کچھ دیر گفتگو سیاسیات پر رہی۔ سیاسی گفتگو پاکستان کے عہدہ داروں سے کرنے میں اب تک بڑی احتیاط برتی تھی۔ ان سے اس احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اب پاکستان کے عہدہ دار نہیں آزاد تھے۔ باتیں خاصی اونچی رہیں اور ان کی بین الاقوامی شہرت کے مطابق۔ بات کرکے جی خوش ہوا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ گفتگو کسی بلند

سیاسی شخصیت سے ہو رہی ہے۔ بڑی خوشی اس کی ہوئی کہ ہندوستان و پاکستان کے باب میں موصوف مایوس نہیں بلکہ اچھے خاصے پُرامید نظر آئے۔ اور یہ ایک بڑی فالِ نیک معلوم ہوئی —— قلم یہ سب کیا لکھ گیا۔ ظفر اللہ خاں اور جو کچھ بھی ہوں۔ بہرحال ہیں تو "قادیانی" اور کسی قادیانی کا ذکرِ خیر چاہے وہ جس حیثیت سے اور جس سیاق میں بھی ہو احبابِ کرام سے کیونکر برداشت ہوگا! جی ہاں۔ ان کالموں میں ذکر مدح و توصیف کے ساتھ کسی شریف ہندو کا کر لیجیے، کسی نیک دل مسیحی کا کر لیجیے، کسی اچھے یہودی کا کر لیجیے۔ یہ سب گوارا لیکن قادیانی العقیدہ کا ذکرِ خیر کسی حیثیت سے بھی آجانا۔ صاف "قادیانیت نوازی" ہے!

ذکر احمدیوں کا چل نکلا ہے تو ایک آدھ لطیفہ بھی اور سن لیجیے۔ دو "احمدی" صاحب اور ملنے آئے اور ایک تیسرے صاحب سے ملاقات انڈو پاکستان انجمن کے ایٹ ہوم میں ہو گئی صدق کی جرأتِ اخلاقی کی داد خوب ملتی رہی۔ اور خیر یہ تو حسبِ توقع تھی لیکن ایک صاحب نے تو کمال کر دیا۔ مجھ سے اظہارِ محبت فرماتے فرماتے کہنے لگے کہ "آپ ہمارے مرزا صاحب کے عزیز بھی تو ہوتے ہیں! سبحان اللہ کیا تحقیق ہے! کہیں ایسی ہی واہی تحقیقات نے تو ان حضرات کو "قادیانیت" کے چکر میں نہیں پھنسا رکھا ہے! —— ایک صاحب نے دعوت دی کہ کسی وقت ہماری انجمن احمدیہ میں آکر چائے پیجیے۔ خیر ان سے تو معذرت کر ہی دی لیکن دل نے کہا کہ یہ حضرت اچھے دوست نکلے۔ بیچ شہر میں میرے پٹوانے کی فکر میں!

کراچی آکر یہاں کے علماء میں خاص اشتیاق مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے ملنے کا تھا۔ افسوس ہے کہ پورا نہ ہو سکا۔ مولانا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ شخصاً اتنا متواضع اور تحریر میں اتنے سنجیدہ و محتاط علماء اب کم ہی نکلیں گے۔

واعظ شہر مولانا احتشام الحق کا نام مدت سے سننے میں آرہا تھا۔ زیارت پہلی بار ہوئی اور ملاقاتیں متعدد رہیں۔ زاہد خشک نہیں بڑے باغ و بہار نکلے۔ صورتاً اور صوتاً دونوں طرح حضرت تھانویؒ سے اشبہ۔ اور میری کشش کے لیے یہی بہت تھا ایک جہری نماز ان کے پیچھے پڑھی جی میں آیا کہ

یہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی

فن تجوید کی تو ابجد سے بھی اپنے کو واقفیت نہیں۔ البتہ لحن کی دلکشی تو ہر عامی بھی محسوس کرسکتا ہے۔ وہ بالکل حضرت تھانویؒ کی سی محسوس ہوئی۔ لوگ ان کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں اور کسی پبلک شخصیت کے لئے ایسا ہونا کچھ عجب بھی نہیں۔ انسان کی پوری سیرت و کردار کا تجربہ ملنے اور گہرے سابقہ کے بعد ہی ہوتا ہے، بہ قول حضرت اکبر

اکبر کی برائی بھلائی پوچھ اس کے محلہ والوں سے

ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں دیوان تو اُن کا دیکھا ہے

بہرحال اپنی جو چند صحبتیں ان سے رہیں وہ تو بڑی خوشگوار نکلیں ــــ انھیں کی مجلس میں ملاقات سیفی ندوی اور راسد ملتانی صاحب سے رہی اور راسد صاحب کے کلام سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ اثر زبیری لکھنوی ثم کراچوی کا شمار تو اپنے ہی لوگوں میں ہے، باہر والوں میں نہیں لیکن کلام ان کا بھی اسی مجلس میں سننے میں آیا۔ مولانا احتشام کے بڑے بھائی عزیز الحق صاحب اسلامی شاعر سے ملاقات دہلی کی تھی۔ یہاں تجدید ہوئی۔ کسی اچھے سرکاری عہدہ پر ہیں۔

یہیں حسن اتفاق سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان کی طرف سے مایوسی تھی کہ وہ یہاں نہیں۔ ایک دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور وہاں

جانے کا وقت کہاں تھا۔ لیکن اللہ نے مُحسن لی اور میرے قیام کی آخری تاریخوں میں انہیں کسی ضرورت سے یہاں بھجوا دیا۔ قیام مولانا احتشام الحق ہی کے ہاں تھا اور یہاں آن مل کر تھانہ بھون کی یاد تازہ ہوگئی۔ مولانا ہی کی مجلسوں میں ایک اور صاحب سے نیاز حاصل رہا۔ سفید ریش، عابد و مرتاض حضرت تھانوی سے تعلق رکھنے والے۔ نام یاد نہیں آتا یہاں اور واحدی صاحب کی مجلسوں میں دونوں جگہ ان سے ملاقات ہی۔ (واحدی صاحب بھی اسی پڑوس میں رہتے ہیں) بڑے صاحب فہم معلوم ہوئے اچھا اثر ان کے ملنے کا پڑا۔ افسوس ہے کہ مولوی حاجی شبیر علی صاحب تھانوی کی زیارت نہ ہوسکی اور زیادہ حسرت اس کی ہے کہ اس وقت وہ یاد ہی نہ پڑے ورنہ کوئی صورت ملنے کی شاید نکل ہی آتی۔ ان سے ملاقات تھانہ بھون کی آدھی حاضری کے مرادف تھی۔

مولانا عبدالحامد بدایونی کا شمار میرے لئے علماء کے ذیل میں نہیں آتا۔ بحیثیت ایک قدیم دوست و مخلص کے بڑے تپاک سے ملے اور یہاں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک عالم دین سے کہیں زیادہ بحیثیت ایک لیڈر کے معروف و روشناس ہیں لیکن بہرحال جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے صدر ہیں اور ان کی اس حیثیت سے قطع نظر کیسے کرلی جائے۔ اپنے ہاں جو پارٹی دی اس میں درویشانہ و مشائخانہ سادگی سے کہیں زیادہ لیڈرانہ دھوم دھام تھی اس میں شک نہیں کہ اس پارٹی میں بکثرت اشخاص سے ملاقات ہوگئی۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ سردار عبدالرب نشتر۔ وائس چانسلر ابوبکر احمد حلیم۔ منصور عالم صاحب کسٹوڈین۔ جمال میاں فرنگی محلی۔ حافظ فضل الرحمٰن انصاری ایم۔ اے (علیگ) (ایڈیٹر وائس آف اسلام) وغیرہم۔ تاہم ہجوم کا ایک لازمی چپقلش ہوتی ہی ہے۔ تصویر کشی کا حملہ میرے اوپر کراچی میں پہلے بھی ہوا تھا لیکن وہ انگریزی قسم کا ایٹ ہوم تھا۔ وہاں توقع بھی اسی

کی تھی بے نشان و گمان اس سے کہیں زیادہ شدید حملہ تو یہاں ہوا یعنی عین جمعیۃ علماء اسلام کے دفتر میں بیٹھے میں بجا طور پر پناہ گاہ سمجھ سکتا تھا مشہور مصرعہ " چو کفر از کعبہ برخیزد" کا پورا مصداق! اور اب یہ کیا بیان ہو کر حملہ ہوا بھی تو کس کے ہاتھ سے! — بہرحال جب تیزی کے ساتھ رخصت ہوا ہوں تو معزز مہمانوں کی صف بندی گروپ فوٹو گرافی کے لیے ہو رہی تھی!

مولانا مودودی کی جماعت اسلامی میں اپنے ملنے والے خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں مخلص ترین مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تھے جو قبل اس کے کہ بڑھاپے تک پہنچیں دنیا ہی سے رخصت ہوگئے۔ اس جماعت کی تشدد مزاجی کے بنا پر توقع نہ تھی کہ اس کے کوئی سے بھی رکن اب اس نیاز مند سے ملنا جلنا گوارا کریں گے لیکن اس کے برعکس کئی صاحب ملنے آئے ان میں سب سے نمایاں نام حسن ریاض صاحب کا ہے، بلند شہر کے رہنے والے بڑے پرانے صحافی ہیں۔ مولانا محمد علیؒ کے ہمدرد مرحوم میں بہ طور جونیر کام کیے ہوئے پھر جالب مرحوم کے روزنامہ "ہمت" (لکھنؤ) میں شریک ہو کر ان مرحوم کے بعد تک بھی ہمت محض اپنی بلند ہمتی سے نکالتے رہے اور ابھی کئی پرچوں سے متعلق رہے۔ مخلص مسلمان اور سنجیدہ نویس ہمیشہ سے رہے۔ ایک زمانہ میں سخت مسلم لیگی تھے بلکہ دلی سے نکلنے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سرکاری پرچہ منشور کے اڈیٹر تھے رفتہ رفتہ جماعت اسلامی میں شریک ہوگئے۔(۱) آئے اور اچھی طرح ملے، جماعت سے

(۱) عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت حسن ریاض صاحب کا ایک طویل رجسٹرڈ مکتوب ملا جس میں جماعت اسلامی میں اپنی شرکت سے کامل تبری کی ہے۔

متعلق دو ایک جونیر طالب علم بھی آئے۔ دسویں یا انٹرمیڈیٹ کے پڑھنے والے کمسنی کے تقاضے سے کچھ باتیں جماعتی تشدد کی بھی کر گئے۔ لیکن جب ان کی جمعیۃ الطلبہ کے اونچے نمائندہ خورشید احمد ایم' اے مع اپنے دو ایک ساتھیوں کے ملے تو وہ بڑے شائستہ و مہذب نظر آئے اور ان سے مل کر جی خوش ہوا ——— تبلیغی جوش جس جماعت کا بھی ہو۔ اگر ہوش کی آمیزش سے خالی ہے تو اپنے مقاصد کو بجائے نفع کے کچھ نقصان ہی پہنچا دیتا ہے۔

---
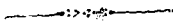
(۱) ان صاحب کا مکتوب ان سطور کی اشاعت کے بعد آیا کہ ان کی جماعت "جماعت اسلامی" سے علیحدہ اپنا کام مستقل حیثیت سے کر رہی ہے۔

(۱۵)

کراچی نمبر (۸)

اس قبلۂ رُوحانیت کا انتشار دیکھو

تاج کمپنی کے منیجنگ ایجنٹ بلکہ عقلِ کل شیخ محمد عنایت اللہ صاحب سے جب ملاقات ہوئی اور انگریزی تفسیر کی سالہا سال سے ملتوی چھپائی کے متعلق تقاضہ کیا گیا تو جواب میں ارشاد ہوا کہ "صرف اچھا کاغذ نہ ملنے سے کام رُکا ہوا ہے آپ اپنے معزز میزبان سے کہہ کر کاغذ کا لائسنس دلوا دیجیئے۔ تو کام ابھی شروع کر دوں۔ یہی جواب وہ پہلے بھی بعض خطوں میں لکھ چکے تھے ــــ خیر محترم میزبان سے کہنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ ان سے اس قسم کی کوئی فرمائش مناسب معلوم ہوئی البتہ شیخ صاحب سے کاغذ کی قسم و مقدار نوٹ کرا لینے کے بعد جی میں یہ آئی کہ اس کا تذکرہ کسی وزیر با تدبیر سے کیجیئے اور لائسنس ان سے لے لیجیئے اور قرآن مجید کے کام کے لئے کون سے آنریبل منسٹر ایسے ہوں گے جو تامل روا رکھیں گے لیکن بالآخر رائے وزیر اعظم کے نام پر جمی۔ دل یوں بھی مسلم مملکت کے سب سے بڑے وزیر سے ملنے کو چاہ رہا تھا اور شاید بالکل قدرۃً

فون کر دیا، وقت مقرر ہوا۔ صبح کے غالباً ۹ بجے کا، وقت پر پہنچا۔ لیکن ابھی اصل کوٹھی نہیں اس کے صدر دروازہ ہی تک رسائی ہوئی تھی کہ حکومت کے رعب داب کی چوکی پہرے۔ دور دباک کا اندازہ ہو گیا۔ سندھ کے لاٹ صاحب کی کوٹھی پر بجائے پوچھ گچھ کے سیدھے سکریٹری ہاتھوں ہاتھ لئے گئے تھے۔ یہاں پھاٹک ہی پر گورنر جنرل

ہاؤس کی کارکو، وک کر پولیس کے ادنیٰ اہلکار میرے سکریٹری سے (جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سیاسیات کے معلم ہیں) ان تیو، ول .... کے ساتھ پیش آئے کہ بجائے شکر کے صبر کا خاصا امتحان ہو گیا اور دل نے کہا کہ حکومت پاکستان صرف شان جمالی ہی نہیں بلکہ جلالی بھی رکھتی ہے ۔ بہر حال ٹھیک وقت مقررہ کے بعد بھی انتظار خاصی دیر کرنا پڑا اور طلبی اس کے بعد ہوئی۔ کیبنٹ کے اجلاس روز ہو رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ غیر معمولی مصروفیت اس کا نتیجہ ہو۔ خیر سامنا ہوا۔ جس طرح ایک حاکم کے سامنے ایک عامی کا ہوتا ہے۔ دو ہی ایک منٹ کے بعد حاضری کی غرض بیان کر دی گئی اور تفسیر مطبوعہ کا نسخہ ہاتھ میں دیدیا گیا۔ تو اسے دیکھ کر وزیر اعظم صاحب متاثر ہوئے۔ اب ملتفت ہوئے اور کاغذ پوری مقدار میں لا دینے کا وعدہ کھلے دل سے کھلے الفاظ میں کیا۔ غرض ملاقات کا انجام اس کے آغاز سے بہتر رہا۔ اور کم سے کم اس خدمت قرآنی کی حد تک حاضری پوری طرح کامیاب رہی۔ ایک اور صاحب کا کام بھی قرآن مجید ہی کے سلسلہ کا تھا۔ اس کی بابت عرض کیا گیا۔ اس گزارش کی پذیرائی بھی توجہ والتفات کے ساتھ ہوئی۔

روانگی میں ایک دن باقی تھا کہ ریڈیائی تقریر کا وقت مقرر ہوا۔ عنوان اس دارد ی میں قدرۃً میرے ہی اوپر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کوئی سیاسی یا نیم سیاسی موضوع تو یوں بھی خارج از بحث تھا کسی ادبی۔ یا علمی موضوع پر بھی گفتگو کے لئے فرصت کی ضرورت تھی۔ برجستہ ذہن میں آپ بیتی کا عنوان آیا۔ مولانا کہلانے سے قبل[1] وقت مقررہ پر ریڈیو گھر پہنچا۔ عمارت عظیم الشان اور ہر طرح دار الحکومت کے شایان شان تو خیر ہوتی ہی۔ دل یہ دیکھ کر خوش ہو گیا

(۱) ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر۱

کہ اندر کے صدر دروازہ پر قرآن مجید کی آیت کا ایک ٹکڑا "قُولُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا" کندہ ہے اور انتہا ہی نہیں بلکہ میز پر جو سرکاری سادہ کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ ان پر بھی یہی مونوگرام درج تھا ـــ حکومت پاکستان کی بے دینی کا پروپیگنڈا اپنوں اور بے گانوں دونوں نے انتہا بے پناہ کیا ہے کہ مذہبیت اور دینداری کی ہلکی نشانیاں بھی جو ملیں، جی نہیں مانتا کہ انھیں بے ذکر کئے گزر جایا جائے ـــ تقریر ہوئی ۱۲، ۱۳ منٹ کے اندر اپنے طالب علمی کے دور کی گمراہیوں کی سرگزشت اور الحاد سے پھر اسلام کی طرف بازگشت کی روئیداد مختصر الفاظ میں سنادی گئی۔ تقریر اس وقت ریکارڈ کرلی گئی اور اخبارات میں اعلان کے بعد دوسرے دن شام کو عین میری روانگی کے وقت نشر کردی گئی۔

کراچی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر غلام قادر فرید رامپوری اپنے بالواسطہ عزیزوں میں ہوتے ہیں۔ کئی سال بعد ملاقات کی نوبت آئی اور یہیں حفیظ ہوشیارپوری سے بھی ملاقات کی تجدید ہوئی۔ ۱۳-۱۴ سال ہوئے لاہور میں ایک بار ملنا ہوا تھا۔ سید محقق دہلوی چیف نیوز اڈیٹر تو اسٹیشن ہی پر ملاقات کو پہونچ گئے تھے اور پھر گورنر جنرل ہاؤس میں بھی آکر دیر تک رہے تھے ـــ بہرحال یہ نشری تجربہ کامیاب و خوشگوار رہا۔

چودھری خلیق الزماں ایک زمانہ میں یو۔پی خصوصاً لکھنؤ کی مسلم سیاسیات کی جان تھے۔ کانگرس، خلافت، مسلم لیگ ہر تحریک میں مسلمان انھیں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے رہے اور ان کی قیادت سال دو سال نہیں ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء سے لے کر ۴۶ و ۴۷ء تک ۲۵-۲۶ سال مسلسل قائم رہی اور اپنے ذاتی قرابتی

تعلقات ان سے ان کی اس پبلک حیثیت کے علاوہ ۔ سفر کراچی کا جب کبھی خیال آیا تھا تو سب سے پہلا تصور انہیں کا آتا ۔ اللہ کی مشیت کہ اب جب واقعی جانے کی صورت بنی تو چودھری صاحب کراچی سے ہزاروں میل دور انڈونیشیا میں مقیم نکلے ۔ بہرحال انکی حسرت ملاقات کراچی کے قیام بھر خلش پیدا کئے رہی ۔

باقی جن لوگوں سے کراچی میں ملنے کی آرزو تھی ان میں ایک اونچا نام خواجہ ناظم الدین صاحب سلمہ اللہ (مرحوم وزیر اعظم و مرحوم گورنر جنرل) کا تھا اور افسوس ہے کہ یہ آرزو جوں کی توں رہی ۔ پروگرام کچھ اس طرح جکڑا کسا رہا کہ ان کے ہاں حاضری کا کوئی وقت ہی نہ نکل سکا اور خود انھیں اپنے ہاں طلب کرنے کی تو ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا ۔ ان کی اسلامیت کے شہرے ایک ایک کی زبان پر تھے اور عبرت کی آنکھ کے لئے یہ نظارہ کچھ کم نہ تھا کہ ابھی کل تک پاکستان میں جو سب کچھ تھا وہ آج کچھ بھی نہیں ہے اور پھر انقلاب ہوا بھی تو کیسا دفعتاً کیسا آناً فاناً ! ــــ دوسری جس ہستی سے ملنے کا شوق تھا وہ سردار عبدالرب نشتر کی تھی ۔ ان سے ان کی مشہور و معروف اسلامیت کے علاوہ دوسرا رشتۂ اشتراک حضرت اکبر الٰہ آبادی سے عقیدت مندی کا تھا ۔ بظاہر کوئی صورت ان سے بھی ملنے کی نہیں رہی تھی کہ بالکل آخری دن روانگی سے دو تین گھنٹہ قبل ایک پارٹی میں ملاقات ہو گئی ۔ ایک تو وقت تنگ اور پھر ہجوم بزم گفتگو قدرتاً بہت تشنہ رہی ۔ پھر بھی جتنی رہی ، اچھی رہی اور بہ حیثیت مجموعی قلب پر بڑا خوشگوار نقش نشتر صاحب کا رہا ــــ ایک پرانے کرم فرما محمد امین صاحب زبیری مارہروی ثم کراچوی (صاحب "ضیائے حیات") ہیں ، ان سے ملنے کا پہلے تو خیال ہی نہ آیا اور جب آخر میں ان کی طرف سے یاد دہانی ہوئی جب بھی ملاقات کی عملی صورت نہ نکل سکی اور صرف حسرت ملاقات لئے واپس چلا آیا ــــ اور لیجئے ایک نام تو چھوٹا ہی جا رہا تھا خوش قسمتی سے

یاد پڑ گیا۔ یہ چوتھا نام مولوی تمیز الدین صاحب صدر اسمبلی و صدر جمعیۃ الفلاح" کا تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق اسلامیت کی بنا پر خواجہ صاحب ہی کی طرح ان سے بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ حسرت ہی رہی، شوق پورا ہونے کی کوئی صورت نہ نکل سکی اور اسکی اصل ذمہ داری اپنے ہی سہو و نسیان پر ہے ـــــ اور اسی فہرست میں ان دو ناموں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ ایک شعیب قریشی صاحب (سفیر پاکستان برائے عراق) دوسرے خواجہ شہاب الدین صاحب (سفیر پاکستان برائے حجاز) شعیب صاحب سے ذاتی نیاز مندی بہت قدیم ہے اور خواجہ صاحب کی شہرۂ آفاق اسلامیت نے ان کی زیارت کا مشتاق عرصہ سے بنا رکھا تھا۔ ڈاکٹر زبید احمد ایم۔اے۔ پی، ایچ، ڈی۔ (سابق استاد عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) کا ذکر اب تک نہ آسکا۔ یہ فروگزاشت ناقابل معافی ہے۔ اپنے علم و فضل اپنی سیرت و کردار اپنے جوش ایمانی ہر اعتبار سے ملنے کے قابل ہستی تھی۔ باوجود پیری میں تکلیف کے آخری روز ملنے آئے اور کچھ دیر تک اپنی گفتگو سے مستفید کیا۔

کراچی رہتے اب آٹھ دن ہو چکے تھے اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں کافی ہو چکی تھیں۔ کراچی یا لاہور۔ دونوں شہروں میں ایک بڑا تکلیف دہ احساس اس کا ہوا کہ بے اطمینانی اور بے چینی عام ہے۔ ہر فریق دوسرے سے بدگمان، اپنی حالت پر غیر مطمئن اور سب مل کر کہنا چاہیئے کہ حکومت و حکام سے غیر مطمئن، بات بات پر ان پر نکتہ چینی اور ان کی جانب سے بدگمانی ـــــ گویا حکمران بھی اپنے میں سے نہیں بلکہ باہر سے لے آئے گئے ہیں! ـــــ یہ ذہنیت کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں معلوم ہوئی۔ مسلمان کہیں کے بھی ہوں اب ان کا ذہن گویا مستقل طور پر اسی سانچہ میں ڈھل گیا ہے اور اپنوں پر نکتہ چینی اور ان سے بدگمانی تو جیسے ملت کی رگ رگ میں گھس گئی ہے۔ انھیں اپنے لیڈر تو فرشتے چاہئیں، ہر تخریبی اور محض

جوشیلے مشغلہ میں سب سے آگے نعرے لگانے اور جھنڈے نکالنے میں پیش پیش لیکن ادھر تعمیری کام کے حدود شروع ہوئے اور ادھر آپس ہی میں الزام تراشی اور دل آزاری کی بنیاد پڑ گئی۔ بانی پاکستان بیچارہ خوش قسمت تھے کہ جلد ہی اپنے رب سے جا ملے۔ زندہ رہ گئے ہوتے تو کیا اپنوں کے زخم لسان سے بچے رہ سکتے تھے؟ بہرحال یہ تو اپنا کچھ قومی خاصہ ہی سامنے چکا ہے لیکن اس عمومی سبب کے علاوہ ایک خصوصی سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان کے اکثر اعلیٰ ارکان حکومت مثلاً وزیر خزانہ، وزیر داخلہ، وزیر دفاع اور خود وزیر اعظم "پبلک" آدمی نہیں بلکہ شروع سے اب تک صرف سرکاری آدمی رہے ہیں اور سرکاری آدمی بالفرض کارگزار اور فرض شناس بھی ہوں۔ جب بھی پبلک کے معتمد علیہ درجہ کامل میں تو نہیں ہو سکتے۔ سرکاری خدمات ہی میں نیک نامی، کارگزاری، فرض شناسی اگر کافی ہوتی تو اس معیار پر غلام محمد صاحب تو بہرحال پورے اتر ہی سکتے ہیں لیکن قوم اچھی حکومت سے بڑھ کر "اپنی حکومت" ڈھونڈھتی ہے اور یہ پیاس دفتر کی فائلوں سے نہیں بجھتی چاہے وہ کتنی ہی قابلیت سے مرتب کی ہوئی ہوں۔ وہ تو بجھتی ہے، عیدگاہ میں بغلگیر ہونے سے، مسجد میں ایک صف میں بیٹھنے سے۔ سرراہ علیک سلیک ہوتے رہنے سے، اور شادی وغم کی محفلوں میں شرکت سے۔

اپنی صحافتی برادری کے جن لوگوں سے ملنے کا اشتیاق تھا ان میں ایک ممتاز ذات حافظ فضل الرحمٰن انصاری ایم۔ اے بی۔ ٹی۔ ایچ (علیگ) اڈیٹر انگریزی ماہنامہ "وائس آف اسلام" کی تھی۔ ملاقات آخری دن ہوئی۔ گو بہت ہی تشنہ و ناتمام رہی ــــــ جمال میاں فرنگی محلی سلمہ اللہ سے توقع تھی کہ وہ بے نشان و گمان یہاں مل جائیں گے

ملے اور حسبِ توقع خوب ہی ملے، وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں گویا اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا کے مصداق۔ اور ان کا مل جانا ایک ہی وقت میں ایک مخلص دوست، ایک عزیز قریب، ایک شریف ترین انسان۔ ایک متوازن و صائب رائے رکھنے والی شخصیت اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کے دوست سے مل جانا ہوتا ہے۔ بڑی باموقع اور موثر تقریر انھوں نے ایک عصرانہ کے موقع پر کی۔ جب مہمانوں کی طرف سے جوابی تقریر کے لئے نامزدگی انھیں کی ہوئی۔ انھوں نے کہا:-

"اللہ کی نعمت کی ناقدری جب کی جاتی ہے تو وہ نعمت چھن جاتی ہے۔ آپ لوگوں کو ایک مستقل حکومت کی جو نعمت مل گئی ہے اس کی قدر کرنا سیکھئے ہر وقت شکوہ شکایت میں لگے رہنا اس نعمت کی قدر نہ ہوئی ناقدری ہوئی۔"

جمال میاں سے بھی بڑھ کر اچانک اور غیر متوقع ملاقات ایک دوسرے فرنگی محلی عزیز اور لکھنؤ کے خوش بیان مقرر مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید سے ہوئی۔ لکھنؤ اور لکھنویت کا ایک مثالی نمونہ۔ جہاں کہیں بھی مل جائیں بس سمجھئے کہ وہیں لکھنؤ ہے۔ اُترے بھی آکر تو کہاں ؟ حاجی اصطفا خاں صاحب (مشہور کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی لکھنؤی کے سابق مالک) کے ہاں جو خود لکھنویت کے عطر مجسّم ہیں! لفظ "دو آتشہ" کے استعمال کا صحیح محل شاید یہی ہے! ان کی تقریر کے شائقوں اور قدر دانوں نے انھیں لکھنؤ سے لاہور کسی جلسہ کے لئے بلایا تھا۔ کراچی کی کشش انھیں یہاں لے آئی۔ کاش یہاں بھی ان کے دو ایک بیان ہو گئے ہوتے ـــــ خاں صاحب نے اپنے مکان کا نام "گل ولا" (GALA VILA) انگریزی قسم کا خدا معلوم کیوں رکھا۔ اس سے تو گلکدہ اچھا رہتا۔ اسی گلکدہ میں

ہومیوپیتھ ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ سالہا سال کے بعد۔ اور ان سے مل کر تھانہ بھون کی یاد تازہ ہو گئی۔ حضرت تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفۂ مجاز ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا جنازہ انھیں سے پڑھوایا گیا تھا۔

کراچی کی صحبتوں کا ذکر اب ختم ہونے پر آ رہا ہے۔ بڑی ناشکری ہو گی اگر دو صاحبوں کا ذکر خیر خصوصی طور پر نہ کیا جائے۔ ان میں سے ایک خواجہ عبدالوحید لاہوری ثم کراچوی ہیں۔ ضابطہ سے محکمۂ اطلاعات میں منسلک، لیکن درحقیقت نہ معلوم کتنی اسلامی تحریکوں کے روح رواں اور انگریزی کتابی معلومات کے ایک چلتے پھرتے قاموس۔ اور دوسرے خان بہادر ضیاءالدین احمد برنی دہلوی ہیں جو کبھی بمبئی کے تھے اور اب کراچی کے ہو چکے ہیں میرے قدیم کرمفرما اور بڑے فعّال مستعد و کارگزار۔ ان دونوں نے اپنا گویا سارا وقت اس نیاز مند ہی کے لئے وقف کر رکھا تھا، ہر وقت موجود ہر جگہ ساتھ۔ تنخواہ دار مقامی سکریٹری رکھے ہوتے تو وہ بھی ان دونوں سے بڑھ کر کارگزار ثابت ہوتے۔

﴿۱۶﴾

کراچی سے لاہور

گفتگو طول میں کھنچتی ہی چلی گئی۔ اور جو بات شاید چند سطروں میں بھی کہی جا سکتی تھی ورق پر ورق بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوئے! دراز نفسی کے لئے خصوصیت کچھ واعظ غریب کی نہیں، واقعات کی بجائے خود کثرت و فراوانی اور پھر ان کا گوناگوں تعدد اور اس پر مستزاد تنوع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعات کے ساتھ ساتھ واردات خارجی کے نقوش کے قدم سے قدم ملائے قلب کے تاثرات شعر بڑھ کر وہ غزل کی حد تک نہ پہنچ جائے اور مضمون رسالہ کی ضخامت نہ اختیار کر لے، تو اور کیا ہو سے

یوں ہی فسانۂ شب غم تھا بہت طویل
اور اس پہ پیچ پیچ میں پھر داستان دل!

کہنے کو یوں تو بہت سی باتیں کہنے میں آ گئیں۔ لیکن خود سبزبان سے متعلق بات چیت کچھ یوں ہی سی رہی۔

جانے سے پہلے خیال یہ تھا۔ اور اپنے ملک کے گورنروں کے حالات سے جو تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ اس خیال کی تائید میں تھی کہ گورنر جنرل کا عہدہ بس ایک طرح کا عوام ہی ہے۔ نام بہت بڑا۔ کام بہت تھوڑا۔ ملک غلام محمد صاحب کی عیش سے گزر رہی ہوگی۔ جوانی کے سن کی محنتوں کا کفارہ اب ہمہ وقتی آرام سے کر رہے ہوں گے۔ ملک کا

کام سارا وزیر صاحبان اور ان کے سکرٹری کرتے رہتے ہوں گے اور ان کے سر صرف یہ ہوگا کہ احکام پر دستخط کردیئے کبھی کبھی مسودہ پر ایک نظر کرلی کبھی کچھ ذاتی ہدایات حکام ماتحت کو دیدیئے، باقی سارا وقت تفریح کی نذر ـــــ آکر جو دیکھا تو صورت حال اس کے برعکس ہی پائی ۔ صبح کام، شام کام، جب دیکھیے "کام" اور عیش و تفریح کے لیے فرصت برائے نام ہے ۔ ابھی معلوم ہوا کہ فلاں سکرٹری کا غذات لے کر گئے ہوئے ہیں ۔ ابھی سُنا کہ فلاں محکمہ کے افسروں کی پیشی ہو رہی ہے ۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اتنے اونچے مرتبہ پر پہنچ کر امت محمدی کا ایک فرد تو اپنے جوانی کے زمانہ کی ذہانت و فرض شناسی کی روایتوں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

ملک صاحب گورنر جنرل ہاؤس میں بیٹھ کر گویا بادشاہی کرتے ہیں ۔ ان کے ذاتی اسٹاف میں شاید سب سے بڑے افسر ملٹری سکرٹری کہلاتے ہیں ۔ پھر پرائیوٹ سکرٹری کا نمبر آتا ہے اور ان کے دو دو اسسٹنٹ ہیں ۔ اے ۔ ڈی ۔ سی ایک ایک نہیں چار چار کی تعداد میں چاروں کام کے لئے چلتے پھرتے نہیں، یہ کہیئے کہ دوڑتے رہتے ہیں ۔ ملک صاحب کا رعب داب سب پہ قائم ہے ۔ یہ بات کبھی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے ۔ ورنہ عام طور سے خیال تو یہی پھیل گیا ہے کہ رعب داب انگریزوں کے ساتھ رخصت ہوگیا اور اب نہ ڈسپلن کا وجود باقی ہے نہ کام میں مستعدی کا ۔ ہر عہدہ دار اپنی جگہ پر احدی اور کام چوری، کاہلی اور فرض فراموشی کا پتلا بنا ہوا ۔ گو پنڈت جواہر لال اور ان کے گرد و پیش کی حد تک ہندوستان میں بھی یہ کلیہ صحیح نہیں۔

میزبان کی حیثیت سے بھی ملک صاحب ایک اعتبار سے مثالی میزبان ثابت ہوئے ۔ کھانے پینے کی خاطر دن اور ہر طرح کے مادی آرام اور آسائشوں کا تو خیر کہنا ہی نہیں ۔ اس کا کچھ اندازہ تو پہلے ہی سے تھا ۔ باقی بڑی چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ مہمان کے مذاق طبیعت کا خیال خاص طور پر رکھا ۔ یہ بات بہت کم میزبانوں کے حصہ میں آتی ہے ۔ بس یہی خاطر

اور ان بیچارے دھند فرمائشوں کی بھرمار رکھی جاتی ہے۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس رہا، فرمائشیں
وہ کرائیں جن کی تعمیل بغیر دل پر کسی قسم کا بار ڈالے کر سکتا تھا۔ مثلاً ایک نشری تقریر یا
کراچی کے اردو ایڈیٹروں سے ملاقات کی تقریب، یا انڈو پاکستان انجمن کی طرف سے
ایٹ ہوم، اتنا لحاظ کون میزبان کس مہمان کا رکھتا ہے اور پھر جب میزبان اتنا عالی مرتبہ
ہو اور مہمان ایک گمنام گوشہ نشین! اس سے بڑھ کر یہ کہ میرے وقت کو بالکل آزاد رکھا۔
جہاں چاہتا آزادی سے جاتا آتا اور جس سے جتنی دیر چاہتا ملتا جلتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے
پاس باریابی کے مواقع کچھ واجبی ہی سے دیے۔ دربارداری کا جس کو سلیقہ نہ ہو اس کے لئے
عافیت اسی میں ہے کہ دربار سے تعلق ہی کم سے کم رکھے۔ زیادہ گفتگو ہوتی تو خدا معلوم
کون کون سی اخلاقی، سیاسی یا مذہبی بحثیں چھڑ جاتیں۔ اللہ نے اس کڑے امتحان سے
بالکل محفوظ رکھا —— میں کوئی مشیر یا اتالیق بن کر گیا بھی نہ تھا محض ایک ذاتی نیازمندی
کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور الحمدللہ کہ اسی ذاتی نیازمندی کو لیے ہوئے واپس ہوا۔

اسٹاف کے بڑے چھوٹے جتنے لوگوں سے اپنا سابقہ رہا، بحمداللہ وہ اچھے ہی
ثابت ہوئے۔ عہدہ داروں میں نمبر اول پر پرائیوٹ سکریٹری قدرت اللہ شہاب صاحب
آئی۔سی۔ایس ہیں۔ انھوں نے مختصر زمانۂ قیام میں تو بہرحال موقع کسی شکوہ کا نہ دیا
اور کچھ بڑھ کر خوشگوار تجربے دونوں اسسٹنٹ پرائیوٹ سکریٹریوں فرخ امین صاحب
اور اس۔اے غوری صاحبان سے متعلق بھی رہے۔ میری خاطرداری اے۔ڈی۔سی
لفٹنٹ امام سے متعلق تھی۔ بیچارہ کو میری وجہ سے خاصی زحمت اٹھانا پڑی ہوگی۔ ذاتی
اسٹاف میں ایک خاتون بھی تھیں انگریز یا امریکی۔ ان کا عہدہ تو شاید اسٹینوگرافر کا تھا۔

بہر حال وقت وغیرہ مقرر کرانے کے سلسلہ میں ٹیلیفونی سابقہ ان سے بھی رہا۔ اور وہ برابر مہربانی ہی کرتی رہیں۔ آنے والوں اور وقت مقرر کرانے والوں کا جو تانتا لگا رہا اس سے ٹیلیفون ایکسچنج کے آپریٹر کو یقیناً زحمت ہوئی ہوگی۔ ان کا اور راستان کے اور چھوٹے عہدہ داروں کا جو میرے کام ہنسی خوشی کرتے رہے ان سب کا شکریہ اس تحریر کے ذریعہ پیش ہو رہا ہے ــــــ عہدہ داروں کے ذکر میں ایک صاحب کا نام خصوصیت کے ساتھ لینا ہے۔ یہ مرکزی حکومت کے فنانس سکریٹری ممتاز حسن صاحب ہیں ان کی ہمدردی و مہربانی سے نہ صرف دارالمصنفین کا کام پورا ہو گیا بلکہ میرے ذاتی معاملات بھی ان کی توجہ سے حل ہو گئے۔ مدت دراز سے ایک رقم ایک پبلشر کے ذمہ چلی آرہی تھی وہ وصول ہوئی۔ صدق کی قیمتیں متعدد خریداروں نے ادا کیں۔ غرض کہ چلتے چلتے ایک معقول رقم ادھر سے لانے کے لئے جمع ہو گئی تھی۔ اس کے لانے کی کوئی جائز قانونی صورت بہت آسان نہ تھی (پاکستان و ہندوستان دونوں ملکوں کی رعایا کے واسطے ایک تکلیف دہ ترین صورت یہی مالی بندش کی ہے) اس کا حل انھیں نے نکالا۔ یہ اگر اتنا آڑے نہ آجاتے تو مشکلات میرے حل کئے تو بہر حال نہ ہو پاتیں۔

آٹھ دن کے اندر کراچی دیکھ لینا جس حد تک ممکن تھا، دیکھ لیا گیا۔ شہر اور مضافات کے اکثر حصہ نظر سے سرسری طور پر گزر گئے۔ بڑے بڑے بازاروں اور گزرگاہوں پر پھیلتی ہوئی نگاہ پڑ گئی۔ بڑے اور چھوٹے اور منجھولے تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ظاہر ہے کہ بالکل سرسری ہوا۔ تاہم اپنے ظرف و بصیرت کے مطابق سمجھنے سمجھانے اور پھر کہنے کہلانے کا حق تو ہر جلد باز کو حاصل ہی رہتا ہے۔

کراچی ماشاء اللہ شہر ہے بہت اچھا۔ خوشنما، کشادہ، آباد و پر رونق، پاکستان جیسی کم عمر مملکت کے شایان شان، البتہ وسیع، عالی شان و سربفلک عمارتوں کے ساتھ ساتھ تنگ و تاریک، غلیظ گلیاں اور گری پڑی جھونپڑیاں بھی نظر میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ لیکن جو صورت حالات شہر کی تشکیل میں پیش آتی چلی گئی، اس لحاظ سے ایسا ہونا شاید کچھ ناگزیر ہی تھا ـــــ مسجدیں لاہور کی طرح یہاں بھی آباد نکلیں، عصر و مغرب کی نماز میں عموماً مسجدوں ہی میں پڑھیں۔ ہر مسجد میں نمازی بڑی تعداد میں ملے۔ عورتوں کی بے حیائی کی خبریں جس شد و مد سے سننے میں آئی تھیں وہ بھی اچھی خاصی مبالغہ آمیز نکلیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہر کے کسی حصہ میں بے حیائی عام ہو۔ لیکن عموماً تو کیفیت اس وقت تک بحمد اللہ ہرگز نہیں رہی محض بے پردگی، وہ ہے۔ لیکن اتنی عام وہ بھی نہیں جو دور بیٹھے سنائی دے رہی تھی اور جتنی بھی ہے اس اظہار حقیقت کو گوارا کیا جائے کہ اس میں ایک حد تک دخل بعض علمائے کرام اور مخصوص جماعتوں کی شدت پسندی کو ہے اگر ادھر سے اتنا اور بے جہتی تشدد نہ برتا جاتا تو ادھر سے بھی اتنی ضد نہ پیدا ہوتی۔ عورت کی بے مہار آزادی کا اندازہ یہاں کے اخبارات کے مراسلاتی کالموں سے ہوتا ہے۔ اخبار انگریزی ہی کے نہیں بعض اردو اخبارات سے بھی۔

ایک بڑی بات یہ کہ لاہور کی طرح یہاں بھی عمارتوں، باغوں، سڑکوں وغیرہ کے نام اب تک ہندوؤں، مسیحیوں، مجوسیوں کے نام کے ساتھ قائم ہیں۔ گاندھی گارڈن۔ ڈاکٹر گیدومل روڈ۔ وکٹوریہ روڈ۔ اس کی مثالیں یاد رہ گئیں۔

آٹھ دن کی بساط ہی کیا تھی، بڑی بڑی طویل عمریں، عمر کی بڑی سی بڑی مہلتیں دیکھتے ہی دیکھتے تمام ہو جاتی ہیں۔ اٹھوارا پلک جھپکتے ختم ہو گیا۔ ۷ اپریل ۱۹۵۵ء کو

صبح یہاں داخلہ ہوا تھا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء کی شام بات کہتے آگئی ؎

کٹی رات حسنِ حکایات میں

سحر ہوگئی بات کی بات میں

اور محبت کرنے والوں کے اس شہر کو بہرحال چھوڑنا پڑا۔ اور رات آٹھ سے قبل کا وقت تھا جب پوری پارٹی اسٹیشن پہنچ گئی۔ ایک سٹی اسٹیشن تھا جو کراچی کا آخری اسٹیشن ہے۔ رخصت کرنے والوں کا ہجوم حسب توقع اچھا خاصہ تھا۔ نام سب کے نہ اب یاد، نہ دُہرانے کی ضرورت۔ اتنا یاد ہے کہ ایک مجمع میں علاوہ عزیزوں، دوستوں، شناساؤں کے کچھ اجنبی حضرات بھی تھے۔ دو ایک دیندار چہرہ والوں نے نصیحت کے لئے خاص طور پر درخواست کی اور اس بے پناہ حُسنِ ظن پر یہ بے عمل کٹ کر رہ گیا۔ ایک صاحب نے عین گاڑی چھوٹتے وقت ایک اچھے قسم کا فاونٹن پن (روشنائی دار قلم) پیش کردیا۔ اب ان کا نہ نام ذہن میں ہے نہ چہرہ مہرہ اجر خالص ان کے حصہ میں رہا۔ ناشتہ کے نام سے کھانے کے ذخیرے الگ نہیں متعدد مہربانوں نے ساتھ کردئیے اور رخصتی اس طرح ہوئی کہ جیسے کوئی پردیس سے اپنے وطن کو نہیں بلکہ وطن سے باہر جارہا ہے۔ وطن شاید مٹی کے ذرات اور مٹی چونے کے در و دیوار سے بڑھ کر نام محبت کرنے والوں کا ہے!

ایک عزیز خاص اسکواڈرن لیڈر ڈاکٹر زماں (ہوائی فوج کے فہیم الزماں علیگ رامپوری) کا نام قیام لاہور کے سلسلے میں آچکا ہے۔ کسی سرکاری ضرورت سے پشاور سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ فرشتہ رحمت بنے ہوئے یہاں سے ساتھ ہوگئے اور راستہ بھر برابر خدمت کرتے اور ہر طرح آرام پہونچاتے رہے۔ کچھ عزیز کراچی کنٹونمنٹ تک ساتھ آئے اور یہاں ایک اور جماعت رخصت کرنے والوں کی ملی۔ گاڑی قریب ۱۲ بجے شب کے

حیدرآباد سے گزری اور ایسے ناوقت بھی چار یا پانچ صاحب پلیٹ فارم پر موجود! ایک وہی مولانا گیلانی کے صاحبزادہ اور دو تاجپور کے مخلص جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ایک آدھ صاحب اور!

رات گزری اور دن نکلا۔ اور اسٹیشنوں کے سارے وہی منظر اپنے کو دہراتے رہے جو ادھر سے جاتے ہوئے پیش آئے تھے۔ بھاول پور، ملتان، مانٹگمری، خدا معلوم کتنے مقامات سے بوئے محبت آئی! لیکن جی کا ہر چاہا ہوا پورا ہونا انسان کے مقدر میں کہاں رکھا گیا ہے؟ زندگی کے سارے سفر میں کتنے مقامات کو بس نگاہ حسرت سے ہی سے دیکھتے ہوئے گزر جانے پر قناعت کرنا پڑتی ہے، غالب نے تو ناجائز حسرتوں کی بھی داد ملنے کی تمنا کی ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

خیر یہ تو ممکن ہے کہ نری شاعری ہو۔ لیکن بہر حال جائز حسرتیں تو ہر مومن کے لئے ایک بڑا ذخیرۂ آخرت ہوتی ہی ہیں۔

:بنزل ۱۷:
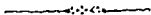
لاہور نمبر (۴)

۱۶ر اپریل۔ شام کے آٹھ بج چکے تھے کہ سواد لاہور شروع ہوگیا۔ اور منٹوں کے اندر اسٹیشن کا پلیٹ فارم آگیا۔ چند حضرات اس وقت بھی موجود تھے یعنی علاوہ میزبان اور ان کے عزیزوں کے مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی۔ سید اشرف صبوحی دہلوی۔ خواجہ بدرالسلام فروغی وغیرہم اور ایک مجسٹریٹ میزبان کے نمائندہ کی حیثیت سے۔ یہ فروغی صاحب میاں اسلم صاحب کے مشہور ناشر ہیں اور انھیں کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ دیکھنے میں "صاحب نما" لیکن اندر سے مسلمان ہی مسلمان۔ سواری کا انتظام بھی حکومت ہی کی طرف سے۔ قیام حسب معمول انھیں میزبان، میجر صدیقی (۸۵ مانٹگومری روڈ کنٹونمنٹ) کے ہاں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ مجسٹریٹ صاحب نے نمائندگی کے فرائض پوری طرح ادا کئے اور اپنی وسعت اخلاق سے دیر تک بیٹھے رہے۔ جعفری صاحب بھی اچھا خاصہ وقت گزار کر واپس گئے۔ اور صبح جب آئے تو ایک اور صاحب کو ساتھ لئے ہوئے، یہ صاحب کوئی "تابع مہمل" نہ تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی تھے خاصے پُرانے اہل علم اور بزم ثقافت میں جعفری صاحب کے ہم بزم۔ ان سے کوئی ۱۴۔ ۱۵ سال پہلے اسی لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت بالکل جوان تھے۔ اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث۔ لیکن اعتقادی، کلامی، فقہی، ہر غلو ندوی "کلچر" سے دبا ہوا۔ مہذب،

شُستہ اور شائستہ گفتگو ان صاحبین کے ساتھ شروع ہوا۔ آج ناشتہ فروغی صاحب کے ہاں تھا۔ ناشتہ دعوت نما ہونا ہی تھا۔ اور یہی ہوا۔ ناشر صاحب مصنف صاحب سے دب کر کیوں رہنے لگے تھے۔ خاصہ مجمع تھا۔ اور صاحبوں کے نام اب ذہن میں نہیں۔ اور میاں صاحب کی موجودگی تو بہر حال ضروری تھی ہی۔ فروغی صاحب کے کاروبار کو دیکھا۔ ماشاء اللہ فروغ پر ہے۔ امت کی بڑی خدمت اس دور میں اسلامی و اصلاحی ناول و افسانہ کے ذریعے بھی کی جا سکتی ہے اور اس میں میاں صاحب اور ان کے ناشر دونوں لگے ہوئے ہیں ـــــ خیال ایسا ہوتا تھا کہ ترقی پسندی کی آندھی نے اسلامی و اصلاحی ناول کا چراغ مدت ہوئی گل کر دیا ہوگا اور اس جنس کے تاجر کس مپرسی کے عالم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں گے لیکن فروغی صاحب کے کاروبار کا فروغ دیکھ کر دل خوش ہوگیا کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ خریدار اور قدردان اس قسم کے ادب کے بھی ماشاء اللہ ابھی بڑی تعداد میں موجود ہیں ـــــ آج انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دین کی حمایت میں کن کن محاذوں پر لڑنا ناگزیر ہے اور ان میں سے ایک اہم ترین مورچہ شعر و ادب کا ہے۔

راستہ میں دو رسے حضرت میاں میرؒ کا مزار دکھائی دیا۔ اقبال کا کون پڑھنے والا ان کے نام نامی سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ موٹر ہی سے فاتحہ پڑھ دیا۔ دوپہر کے قبل جب گھر واپس آیا تو کچھ ہی دیر بعد مولانا مودودی کے برادر بزرگ (گو خورد نما) مولوی ابوالخیر صاحب مودودی نے کرم فرمایا۔ دو اور صاحب بھی انھیں کی جماعت کے ان کے ہمراہ تھے۔ جی تو خود مولانا ہی سے ملنے کو چاہتا تھا وہ اس وقت تک جیل سے رہا نہیں ہوئے تھے مجبوراً پانی کے پیاسے کو شبنم پر قناعت کرنا پڑی ـــــ جی چاہتا تھا کہ مولانا مفتی

محمد حسن صاحب مدظلہ سے ایک بار اور نیاز حاصل ہو جاتا اور مولانا شاہ محمد جعفر ندوی سے بھی ملاقات تشنہ ہی رہی اور کسی طرح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی میکش صاحب اور احسان دانش صاحب اور ابن الحسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کی صورت نکل آتی۔ ان آرزوؤں میں سے کوئی بھی پوری نہ ہو پائی اور دوپہر کو اسٹیشن آ گیا ـــــــ اور دیکھیے گورنمنٹ کالج لاہور سابق استاد ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ کا نام ایسا ذہن سے نکلا کہ پاکستان کے قیام بھر یاد نہ پڑا۔ نہ اس کے ہفتوں بعد ذہن میں آیا تو اب اگست کی ۱۱ تاریخ کو سفرنامہ کی یہ قسط لکھتے وقت! بشر اپنی کس چیز پر ناز کرے۔ جس حافظہ پر اتنا وثوق و اعتماد ہوتا ہے! اس کا یہ حال ہے۔ لاہور میں نام یاد پڑ جاتا تو کم سے کم یہی دریافت کر لیتا کہ موصوف اب ہیں کہاں۔ اتنا گہرا علم ولایت پلٹ و کاترہ میں ذرا کم ہی ملے گا۔

اسٹیشن پر کئی کئی صاحب موجود۔ عزیزوں کے علاوہ جعفری صاحب کا ہونا تو خیر لازمی تھا۔ میاں اسلم صاحب اور اشرف صبوحی صاحب (جنھوں نے یہ پیام پہنچایا کہ ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں، ورنہ ضرور آتے) مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا محمد اسحاق ایڈیٹر "الاعتصام" یہ اہل حدیث کا ہفتہ وار پرچہ ہے گویا مولانا ثناء اللہ مرحوم کے مشہور "اہل حدیث" کا جانشین۔ ایک مذہبی پرچہ کی ادارت کے باوجود یہ خشک و عبوس نہیں، اچھے خاصے شگفتہ معلوم ہوئے اور ہر طرح ہونہار اور صاحب تبسم۔ ابھی جوان عمر ہیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے اور از راہ محبت بہت پہلے سے آ گئے تھے افسوس ہے کہ اس وقت پورا تعارف نہ ہو سکا۔ بعد کو خیال آیا کہ حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ غالباً اسلامیہ کالج میں اُستاد ہیں۔ اسلامی تاریخ و جغرافیہ پر ان کے کئی مضمون عرصہ ہوا پڑھے تھے قابل قدر تھے اور تحریری تعارف اسی وقت ہو گیا تھا ـــــــ رخصتی کا منظر عموماً مؤثر ہوتا ہے آج

بھی تھا ۔ کراچی اور لاہور دونوں شہر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ پردیس کے ہیں اپنے ہی معلوم ہوتے رہے، یہ رشتہ تو کم وبیش ہر مسلم ملک کے ساتھ ہے پھر پاکستان تو جغرافی حیثیت سے بھی اپنا ہی ہے علیحدگی جو کچھ بھی ہوئی ہے وہ سیاسی حیثیت سے ہے۔ مخلصوں، عزیزوں، دوستوں کی وہ کثرت کہ اپنا وطن ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ٹرین حرکت میں آئی تو یہ محسوس ہونے کے بجائے کہ روانگی وطن کو ہو رہی ہے ایسا محسوس ہوا کہ روانگی وطن سے ہو رہی ہے وطن کے حقوق اپنی جگہ پر مسلم لیکن یہ جذبہ بھی ہرگز منافی وطنیت نہیں

گاڑی دوپہر کے بعد چلی اور اسی گاڑی سے عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ "حق" لکھنؤ وسابق منیجر "صدق" بھی کراچی سے لکھنؤ واپس ہو رہے ہیں۔ کئی مہینہ آئے ہوئے تھے ـــــ گاڑی چلی اور دل اس سوچ میں پڑ گیا کہ دیکھئے اب پھر کب یہاں آنا ہوتا ہے اور سرے سے دوبارہ آنا مقدر رہے بھی یا نہیں۔ اسی مرتبہ آجانے کی توقع کس کو تھی اور ظاہری اسباب تھے ہی کیا؟ یہ محض ایک غیبی القاء تھا کہ جس سے بے شان گمان - گورنر جنرل بہادر کے قلب میں ایک ادنیٰ اور قدیم نیاز مند کو دعوت دینے کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور اس گوشہ نشین نے بھی تامل و تذبذب کے بعد اسے منظور کر لیا۔ اور آنے جانے کی صورت پیدا ہو گئی۔ بیشک جو قادر مطلق ایک بار پر قادر تھا وہ دوسری بار پر بھی اسی آسانی سے قادر ہے لیکن بہرحال جہاں تک اسباب ظاہر کا تعلق ہے وہ جتنے ضعیف تھے اب ان سے بھی ضعیف تر ہو گئے ہیں۔

بات کی بات میں حیدرآباد اسٹیشن آ گیا۔ وہی جہاں پاکستان کی طرف سے زبردست چیکنگ ہوتی ہے اور عام مسافر اس کے نام سے ہول کھاتے ہیں۔ اپنا تجربہ ایک بالکل خصوصی

استثنائی طور پر یہاں پہلی بار بھی خوشگوار رہا تھا اور ابکی تو اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوشگوار رہا
پولیس کسٹم کے ایک افسر ملے وہ بھی مہربان تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اختر حسین
زیدی آگئے اور وہ تو یکسر لطف و کرم ہی نکلے۔ دوسروں کو دیکھ رہا تھا کہ بیچاروں کو رتی رتی
سامان کے ساتھ اتر کر جانا پڑ رہا تھا اور ہر طرح تکلیف ہی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے کو
سرے سے نہ خود اُترنا پڑا نہ کوئی سامان اُترنا پڑا۔ قلی وہی جو لپک کر آئے مایوس واپس
گئے۔ اُلٹی ہم لوگوں کی خاطریں بھی چائے پانی سے ہوتی رہیں۔ میرے سکریٹری ہی جاکر
ضابطہ کی شرطیں پوری کر آئے اور پھر جب ٹرین چلنے لگی تو انھیں زیدی صاحب نے گارڈ سے
کہہ دیا کہ دیکھیے مولانا کو کوئی زحمت نہ اٹاری میں ہونے پائے اور نہ امرتسر میں وَالنّٰزِعٰتِ
غَرْقًا کے ساتھ ساتھ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کا نظارہ ناسوت سے رخصتی اور برزخ میں
داخلہ کے وقت تو ہوتا ہی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ کبھی کبھی جیتے جاگتے اسی حواسوں کی
دنیا میں بھی دیکھنے میں آجاتا ہے۔

اٹاری اسٹیشن کے آجانے میں دیر ہی کیا لگتی۔ یہ ہندوستان کا چیکنگ اسٹیشن ہے
پچھلی بار ادھر سے گزر جانے میں اس کے جو تلخ تجربے ہو چکے تھے اس نے نام ہی کو
دہشت ناک بنا دیا تھا۔ گاڑی رکی لیکن الحمدللہ کہ ابکی یہ منزل بھی آسانی ہی سے
گزر گئی۔ سامان ضرور اُترا اور اس کا جائزہ بھی لیا گیا۔ لیکن ہم میاں بیوی
گاڑی ہی میں بیٹھے رہے ——— ٹرین باری باری ایک روز ہندوستان
کی ہوتی ہے، ایک روز پاکستان کی۔ آج ہندوستان کی ٹرین کا دن تھا۔
اسٹاک (گاڑیاں) اور اسٹاف (عملہ) سب ہندوستان کا تھا۔ گارڈ بیچارہ
بہت شریف تھا۔ اس نے یہاں کے کسٹم والوں سے بھی کہہ دیا اور آگے چل کر

امرت سر پر بھی خیال رکھا۔

امرت سر آگیا پنجاب میل پلیٹ فارم نمبر ایک پر تھا۔ خاصہ وقت وہاں تک پہنچنے میں لگا۔ کتابوں کے گٹھر کے گٹھر بھی ساتھ تھے اور سامان بھی کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ اس پنجاب میل کے ساتھ بھی کیا کیا یادیں وابستہ ہیں۔ امرت سر ابھی کل کی بات ہے کہ لاہور ہی کی طرح ایک اسلامی شہر تھا۔ لاہور وامرتسر دونوں گویا بھائی بھائی تھے۔ آج ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تک رہ چکے ہیں۔ یہی پنجاب میل تھا کہ پنجاب کو یو۔پی، بہار، بنگال سے ملانے والا تھا۔ کلکتہ سے چل کر لکھنؤ ہوتا ہوا لاہور جاکر رکتا تھا۔ اب امرت سر پر ختم اور یہیں سے شروع ہوکر تفرقی کی یاد دلانے والا ہے تحریک خلافت کا دور سامنے آگیا۔ پشاور اور لاہور سے چل کر کیسی ٹولیاں مخلص کارکنوں کی اسی پنجاب میل سے لکھنؤ آیا کرتی تھیں! ـــــ اب وہ سب خواب وخیال ہے!

جالندھر، لدھیانہ، سرہند، انبالہ یہ سارے اسٹیشن حسب معمول راستہ میں گزر گئے اور ۱۸ اپریل کی ٹھیک دوپہر کو مسافر پورے ½ ہفتہ بعد لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہوگیا ـــــ آج پیشوائی کے لئے کوئی مجمع نہ تھا۔ صرف گنتی کے قریبی اعزا موجود تھے۔ مجمع کیوں ہوتا۔ مسافر اپنی ذات سے اُٹھل کھرا جس طرح گیا تھا۔ اسی طرح واپس آگیا۔ "عجوبہ" اور سنسنی خیز صفات اضافی اپنے ساتھ لگاکر نہ لایا۔ جب تماشا ہی سرے سے نہ تھا تو تماشائیوں کے ٹھٹ کیوں لگتے!

اصل سفرنامہ کی قسطیں تمام ہوگئیں۔ جس طرح ایک دن اصل سفر شروع ہوکر ایک دن ختم ہوگیا تھا۔ اسی طرح خود زندگی کا سفر بھی شروع ہوکر ایک دن ختم ہونا ہی ہے اور اس کا

سفرنامہ یعنی "سفرنامہ حیات" آہ! کہ گو اس کی ذمہ داری بہت کچھ مسافر کے اپنے ہاتھ میں
ہوتی ہے پھر بھی اسکی مفصل و مکمل تحریر انسان کے نہیں۔ فرشتوں ہی کے ہاتھ کی
ہو سکتی ہے! اور اپنی حیات ناسوتی میں رہ کر آپ بیتی کے پڑھنے کی اجازت
کس کو! ہے۔

[illegible] تن ز جان وجان ز تن مستور نیست
[illegible] لیک کس را دید جان دستور نیست

(۱۸)

معروضاتِ خصوصی حاصلِ سفر

روداد سفر خدا خدا کرکے ختم ہوئی۔ کسے توقع تھی کہ زندگی میں کبھی بھی اس کا موقع ملے گا۔ اس مختصر سیاحت کا اور اس کی اتنی مفصل روداد نگاری کا! اب اس کے خاتمہ پر جی میں ہے کہ چند مختصر گزارشیں بہ طور حاصل سفر کے عرض کر دی جائیں۔ اور چونکہ ممکن ہے کہ بعض طبائع کو ان معروضات میں شیرینی سے زیادہ تلخی نظر آئے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ شروع ہی میں اقبال کے مشہور مصرعہ کا بھی استحضار کر لیا جائے ع

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

بڑے دکھ اور دلی کرب کے ساتھ یہ محسوس ہوا کہ جس اتحادِ امت، یکدلی یکجہتی کو وجود میں لانے اور اسے ترقی دینے کے لئے پاکستان بنا تھا خود وہی مفقود ہے۔ قدم قدم پر انتشار، بات بات میں اختلاف اور سب سے مہلک زہر رگ رگ میں سرایت کیا ہوا صوبائی تعصب کا! حسرت ہی رہی کہ کسی پنجابی کی زبان سے کسی بنگالی کے حق میں کلمۂ خیر سنا ہوتا۔ کسی بنگالی نے کسی سندھی کا نام خوش دلی کے ساتھ لیا ہوتا۔ کسی سندھی نے کسی سرحدی پر اعتماد ظاہر کیا ہوتا ہوتا! — حد یہ ہے کہ مہاجرین تک مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بجائے محبت و اخوت کے رقابت بلکہ دشمنی کی نظر سے دیکھنے والے "رحماء" کے بجائے

"اَشِدَّاءُ" کے مصداق ۔ یوپی والے ۔ بمبئی والے ۔ بہاری ۔ دکھنی سب الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم، تنظیم سے کوسوں دور! اس زہر کا توڑ صرف ایک ہی تھا! **ایمانی اخوت**۔ یہی سب کو ایک سانچہ میں ڈھال سکتی ہے اور وہی ناپید،

پھر یہ تفریق تو صرف وطنی بنیاد پر تھی۔ خود مذہبی حیثیت سے بھی ایک انتشار کا عالم طاری۔ نئے اور پرانے ملا کر خدا معلوم کتنے فرقے تیار۔ اور کس کثرت و تنوع کے ساتھ دینی دعوتیں بڑے بڑے زبردست داعیوں کی طرف سے جاری! بعض جدید تحریکیں یقیناً اصلاح، اتحاد و مرکزیت ہی کا مقصد لیکر اٹھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ خود ایک مستقل فرقہ، ایک تخریبی عنصر بن گئیں ۔۔۔۔ شکوہ کس کس کا کیا جائے اور کس ایک گروہ یا جماعت کا نام لیکر ذمہ داری اس کے سر ڈالی دی جائے ۔ کسی میں اخلاص ہے تو تدبر نہیں ۔ اور کہیں اگر جوش ہے تو وہ ہوش سے عاری! یہ تذکرہ ہرگز خوشگوار نہیں لیکن اسے نظر انداز کرجانا بھی کیونکر ممکن ہے ؟

ایک اور چیز اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک مرکزی شخصیت کی افسوسناک کمی ہے مسلمان یوں بھی اپنے کسی لیڈر کو لیڈری کے منصب پر قائم رکھنے کے قائل نہیں رہے ہیں۔ مولانا محمد علیؒ کے زمانہ سے یہی تماشا ہندوستان میں دیکھنے میں آرہا ہے ۔ ہر لیڈر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے قصور پیدا کرو۔ اس کی ہر لغزش، ہر بشری کمزوری کی اس مبالغہ کے ساتھ تشہیر کرو۔ اس کے ہر عیب کا اس طرح خوردبینی معائنہ کرو کہ اس میں ہر طرح کیڑے ہی کیڑے نظر آنے لگیں۔ صرف ایک قائد اعظم جناح کی ذات پر سواد اعظم کا کسی طرح اتفاق ہوگیا تھا۔ بس ان کے بعد سے پھر وہی افراتفری اور پاکستان بھر میں کوئی ذات ایسی نظر نہیں آتی جس کی سرداری پر سب کا اجماع تو خیر کیا ہوتا پچاس فیصدی کا اتفاق ہوگیا ہوتا۔ لے دے کے اگر کوئی شخصیت کسی درجہ میں اس وقت متفق علیہ تسلیم کی جاسکتی ہے تو وہ گورنر جنرل ملک غلام محمد ہی کی ہے ۔

ہندوپاکستان کے باہمی تعلقات یہ دیکھ کر دل بہت ہی کڑھا کہ محض آپس کی ضد م ضد انے اس درجہ خراب کر رکھے ہیں۔ نفس تقسیم ملک ہرگز دشمنی کو مستلزم نہیں۔ حقیقی بھائیوں کے درمیان جائداد کی تقسیم ہوتی رہتی ہے اور بار ہا اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدتوں کے بگڑے ہوئے تعلقات ازسرِنو سدھر جاتے ہیں بعینہ یہی صورت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ممکن تھی اور آج بھی ناممکن نہیں ہے۔ لاہور کراچی دونوں جگہ یہ محسوس کرکے دل کو کس درجہ کوفت اور راذیت ہوتی تھی کہ گرد و پیش کے سارے محبت کرنے والے ہی جمع ہیں۔ بہت سے تو عزیز ہیں اور جو عزیز نہیں وہ بھی فرطِ اخلاص کی بناپر عزیزوں ہی شمار کے لائق۔ لیکن اس ساری یگانگت کے باوجود پھر اجنبی، پھر غیر، پھر بیگانے!۔۔۔ مور جنگل میں اپنے خوشنما پر پھیلا پھیلا کر خوش ہو رہا تھا۔ ناچ رہا تھا کہ یک بیک نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی، اور دل کی کلی مرجھا کر رہ گئی!

مطالبۂ قیام پاکستان کا حاصل کل یہی تھا کہ ایک خطۂ زمین پر مسلمانوں کو اپنی آئیڈیالوجی اپنے دینی اصول کے مطابق و ماتحت حکومت قائم کرنے کا پورا موقع حاصل ہو۔ مان لیجیے کہ یہ مطالبہ سو فیصدی صحیح تھا۔ اس سے یہ لازم کہاں سے آتا ہے کہ زندگی یا کم سے کم سیاسی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ میں اشتراک کی نفی ہو گئی؟ شریعت کے اوامر و نواہی، فرائض و واجبات اور ممنوعات و محرمات کا تعلق تو سیاسی زندگی کے بھی چند ہی شعبوں سے ہے اور چند نہ سہی اکثر سہی باقی شعبے جو مباحات کے دائرہ میں ہیں اور جن کا تعلق بلا قید مذہب و ملت عام انسانی فلاح و بہبود سے ہے۔ وہ تو بہر حال پھر بھی کھلے رہ جاتے ہیں اور شہ کوئی بتائے کہ ان میں اشتراک تعاون و اتحاد سے کون سا امر مانع ہے؟ ۔۔۔ چور کو یقیناً اپنے ہاں اسلامی سزا دیجیے۔ شراب کی بندش اپنے ہاں یقیناً یکسر کیجیے۔ فواحش پر سخت سے سخت قدغن ضرور لگائیے۔ سود خوری کا نام و نشان تک

مثاد یجیئے۔ ہر کی تقسیم تمام تر شریعت کے تحت میں لائیے۔ اخلاقی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی فضا سر تا سر اسلامی قالب میں ڈھالیئے۔ لیکن ریل، ڈاک، تار، سڑکوں کی تعمیر، راستوں کی صفائی، حیوانات کی گمشدگی، بیماریوں کے علاج، شفاخانوں کے قیام، جغرافی معلومات، ریاضیات و طبعیات کی تحقیقات وغیرہا جیسیوں غیر اختلافی انتظامی شعبوں میں کوئی تفریق و اختلاف کو کیوں راہ دیجئے؟ اور کیوں نہ ہم مشترک مسائل میں دونوں ہمارے ملک ایک سے زیادہ سے زیادہ مشترک پروگرام تیار رکھیں؟ ان مسائل میں آخر اختلاف و نزاع کی بنیاد کہاں سے قائم ہوتی ہے۔ تاوقتیکہ عقل سلیم کو ضد کا غلام نہ بنا دیا جائے۔ سب سے بڑی کڑی آزمائش ہندی مسلمانوں کے لئے ہے۔ وہ ہندوستان میں رہ کر ایک طرف اپنی وطنیت کو کیسے بھلا دے؟ اپنے اس جغرافی سیاسی قانونی وطن کے حقوق کی طرف سے کیسے غداری بے وفائی اختیار کرے؟ دوسری طرف پاکستان اس کی دینی برادری والوں و عزیزوں کا وطن ہے۔ اس سرزمین کے تہذیبی معاشرتی برادرانہ روابط کو وہ کیا کرے؟ خونی رشتوں کی طرف سے کیسے آنکھ بند کرلے؟ مجنوں غریب کی جان کیلئے تو صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ دونوں عذاب الٰہی کا حکم رکھتے ہیں۔

دونوں ملکوں کے اونچے طبقات میں کیا مخلص اہل فہم بھی ایسے نہیں جو اس اشتراک مع الاختلاف کے موضوع کو اپنا کے اس کی عملی صورتیں نکالیں؟ اور اس طرح لاکھوں نہیں کروڑوں بندگان خدا کی دعائیں اپنے لئے حاصل کریں؟ کتنا مبارک و خوش آئند ہوگا اس دن کا طلوع جب ہندوستان پاکستان کو اپنا قوت بازو اور اپنی مغربی سرحد کا محافظ و پشتیبان سمجھے گا اور پاکستان از سر نو ہندوستان کو اپنا شریک جسم و جان اور ایک مخلص حلیف سمجھنے لگے گا!

متاع وصل خسرو ..... بس گراں است

گر ایں سودا بہ جاں بودے چہ بودے!

ایک طرف غلام محمد، دوسری طرف جواہرلال ان دونوں کے عہد سے بڑھ کر ساعت سعید اس یوم عید کے لئے اور کب آسکتی ہے!

ضمیمہ نمبر (۱)

مولانا کہلانے سے قبل

نشریہ ۔ نشرگاہ کراچی سے ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء ۔ بوقت شام وقفہ ۱۱ منٹ

نیم حکیم خطرۂ جان کے وزن پر نیم ملا خطرۂ ایمان کی کہاوت بھلا کس نے نہ سنی ہوگی آج اسی طرح کے ایک بنے ہوئے اور نام کے مولانا کی داستان حیات کا ایک ٹکڑا چند منٹ میں خود اسی کی زبان سے سُن لیجئے ۔

اپنی آنکھ جس ماحول میں کھُلی، وہ اچھا خاصہ مذہبی تھا ۔ گھرانا کھاتا پیتا ساتھ ہی پورا دیندار، یہ قصہ اٹھارویں صدی آخر کا ہے یا پوری گنتی سننا چاہتے ہوں تو ۱۹۰۲ء کا، عادتیں اپنی بھی قدرتاً مذہبی قسم کی پڑگئیں ۔ نماز روزہ کی پابندی، قرآن مجید کی تلاوت، دینی کتابوں کا مطالعہ وغیرہ اور یہ سب بطور رخشک معمول کے نہیں بلکہ عقائد میں پختگی اور جوش بھی ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کو دین کی تبلیغ بلکہ ان سے مباحثہ و مناظرہ بھی ۔ اسکولی زندگی میں اسلامیت کا یہی عالم رہا ۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی گویا پیدائشی تھا ۔ عنوانات مذہبی کبھی پیش نظر رہے اور باتیں خود سے سوچتا تو خیر کیا اوروں کی لکھی ہوئی پڑھتا اور انھیں کو اپنے قلم سے دُہرا دیتا ۔ اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے ۔ واقعہ بہرحال یہ ہے کہ بُری بھلی مضمون نگاری بارہ سال کے سن سے شروع ہوگئی تھی ۔ ہائی اسکول پاس کرکے داخلہ کالج میں ہوا ۔ اب ۱۹۰۸ء آگیا ۔ اب مستقل رہنا سہنا لکھنؤ میں شروع ہوا جہاں کمی نہ کتابوں کی تھی اور نہ انگریزی قسم کے کتب خانوں کی، ادھر اپنا کا کتب بینی کا پڑا ہوا تھا ۔ جو کتاب بھی سامنے پڑگئی، بس اسے کتاب کے کیڑے کی طرح چاٹ گیا ۔ کوئی یہ بتانے والا تھا نہیں کہ کتاب ہے کس نوعیت اور کس پایہ کی ۔ اتفاق کی بات کہ شروع ہی میں سابقہ جس کتاب سے پڑا وہ ایک سخت ملحد قسم کے انگریز ڈاکٹر کی کتاب (Elements

(of Social Science) تھی۔ الحاد کا راز تو بہت دنوں بعد کھلا۔ ظالم نے پیرایۂ بیان تمامتر علمی یا بقول خود سائنٹیفک اختیار کیا تھا، بظاہر مذہب سے یقیناً یا اثباتاً اسے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ لیکن حقیقتاً اس کی ہر تعلیم کی زد آکر مذہب ہی پر پڑتی تھی۔ خصوصاً دینی اخلاق پر۔ سولہ[۱۶] برس کے سن کی بساط ہی کیا۔ ناتر کے شباب کا زمانہ جوں جوں مطالعہ آگے بڑھا طبیعت اثر قبول کرتی گئی یہاں تک کہ جب سو صفحہ کی کتاب ختم کی ہے تو اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے قلب میں ایمان کی نورانیت کی جگہ الحاد کی ظلمانیت لے چکی تھی۔

بنیاد یوں پڑی۔ تائیدی اسباب قدم قدم پر ملتے گئے۔ ایک لائبریری میں ایک کتاب اور نظر پڑی، موضوع مذہب نہیں تاریخ اور ادب تھا۔ دنیا کے مشاہیر کے ادب پارے اس میں درج تھے اور اسی سلسلہ میں قرآن مجید کے اقتباسات بھی۔ اسی کتاب میں پورے صفحہ پر تصویر نعوذ باللہ حضرت مصنف قرآن کی یعنی ہمارے حضور اکرم صلعم کی درج تھی۔ اور یہ نہ پوچھیے کہ وہ کس درجہ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جسم پر جبا، سر پر عمامہ لیکن کمر میں ایک طرف مثل قبضہ دوسری طرف تلوار اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شانے پر ترکش اور کمان! تیوروں پر بل پڑے ہوئے اور چہرے سے ظالم پن تمامتر خشونت ٹپکتی ہوئی! تصویر کسی پیغمبر یا رحمت عالم پیمبر یا پیمبر کی تو خیر کیا ہوتی، کسی معمولی درجہ کے شریف اور رحمدل انسان کی بھی ہرگز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صاف ایک جلاد قسم کے ڈاکو کی معلوم ہوتی تھی۔ نیچے تصویر کا تاریخی حوالہ بھی درج تھا۔ تصویر کے نقلی اور فرضی ہونے کی طرف ذہن تو اس وقت جا ہی نہ سکتا تھا۔ قدرۃً صاحب تصویر کی شخصیت سے متعلق انتہائی بدعقیدگی پیدا ہو کر رہی۔ انا للہ۔

جب بی۔اے میں پہنچا تو فلسفہ اور نفسیات کی کتابوں کے پڑھنے کا ہوکا تھا۔ ایک نامور ڈاکٹر کی دو ضخیم کتابیں مینٹل فزیالوجی اور مینٹل پیتھولوجی کے نام سے مطالعہ میں بڑی عقیدت کے ساتھ آئیں۔ ان میں بدبخت نے یہ کمال کیا تھا کہ مرض صرع (Epilepsy) کا بیان کرتے کرتے ایک دم سے (بیان) اس میں یہ

ہے ہیا کہ انبیاء کی بعض مشہور ترین اور عظیم ترین ہستیاں بھی اس قسم کے دوسرے مرض میں مبتلا رہی ہیں
چنانچہ نزول وحی کے وقت کے آثار و علامات کا شمار آثار مرض میں کر ڈالا اب فرمایئے کہ ایک سادہ دل
مسلم نوجوان کے دل و دماغ پر پیہم حملے جب اسی قسم کے ہوں تو وہ بیچارہ اپنے ایمان کو کب تک سلامت رکھ
سکتا تھا نتیجہ قدرۃً وہی نکلا جو نکلنا تھا قلب میں الحاد اور ارتیاب پیوست ہو گیا اور دماغ اپنے کو مسلم
کہلانے کے بجائے "ریشنلسٹ" اور "اگناسٹک" کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

مل اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کی تصانیف اس کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا بناتی گئیں عام مولوی ملا
اور مشائخ ایسے مرض کا علاج قطعاً نہیں کر سکتے، ان کے علاج مفید ہونے کے بجائے الٹے مضر ہی
ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نشہ دو ایک دن نہیں کوئی آٹھ دس سال متواتر جاری رہا۔ اللہ کا فضل شامل رہا
کہ اس ساری مدت میں تعلق عقیدت حضرت اکبر الہ آبادی سے بھی قائم رہا، اور وہ حضرت کمال حکمت سے
کھل کر نہیں لیکن چپکے ہی چپکے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں کے ذریعہ سے دین کی تبلیغ برابر کرتے گئے اور اپنے
کلام بلاغت نظام سے مادیت اور فرنگیت سے مرعوبیت دماغ سے ہٹاتے گئے، دوسری رہنما ہستی اسی زمانہ میں
مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر کامریڈ کی رہی، اس وقت تک وہ خود مولانا نہ تھے محض مسٹر تھے لیکن ان کا جوش
اسلامی اس وقت بھی بھلا تبلیغ کئے بغیر کب ماننے والا تھا جب ملتے یا خط لکھتے اس نا مسلم کو مسلمان بنانے
کی کوشش میں لگے رہتے، دونوں ضابطہ سے نہ مولانا تھے نہ مشائخ لیکن سننے کی بات صرف یہ ہے کہ ایک
بھاگے ہوئے غلام کو اس کے مالک کی طرف پھیر کر لانے میں حد درجہ معین ہوتے رہے۔

ہوتے ہوتے ۱۹۱۹ء آ گیا اور اپنی توجہ کی باگ پہلے بدھ مذہب اور پھر ہندو فلسفہ خصوصاً
تھیاسوفسٹ اسکول کی طرف مڑ گئی مسز بسنٹ، آربندو گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس مہاراج
تلک اور اینڈ منڈ ہومز، سال چھ مہینے کے مسلسل مطالعۂ روحانیت نے مادیت و الحاد کا طلسم توڑ کر
رکھدیا اور صاف نظر آنے لگا کہ ایک زبردست عالم روح اور روحانیت کا بھی ہے عین اسی زمانہ میں

شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول شائع ہوئی جس نے پیغمبر اعظم کی پیغمبری نہ سہی تاہم مصلحانہ عظمت و برتری کو پوری طرح قائل کر دیا۔ اس دور میں اتنا بھی بہت غنیمت تھا، اس کے معاً بعد خوش بختی سے سامنے مولانا روم کی بے مثل مثنوی آ گئی ہوگئی اس کے کانپوری ایڈیشن کے چھیوں ضخیم دفتروں کو اول سے آخر تک پڑھ ڈالا گو سمجھ میں بیشتر حصہ نہ آیا پھر بھی اب کیا عرض کیا جائے کہ اس نے کیسی قلب ماہیت کر دی اور پڑھنے والے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور دل ابھی مثنوی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی تفسیر ترجمۃ القرآن ۱۹۲۰ء میں میری نظر کے سامنے آ گیا اور جو کچھ کسر از سر نو مسلمان ہونے میں باقی رہ گئی تھی وہ پوری ہو گئی۔ انگریزی ترجمہ کا اثر ہی انگریزی خوانوں پر کچھ اور ہوتا ہے۔

اس ساری سمع خراشی سے مقصود صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جس طرح ضلالت کے اسباب بے شمار ہیں اور الحاد کیسے کیسے مخفی راستوں سے آتا رہتا ہے اسی طرح ہدایت کے راستے بھی بے شمار ہیں اور روشنی دکھانا ضابطہ کے علماء اور مشائخ کے ساتھ مخصوص ہرگز نہیں اپنے اس دور گمراہی میں میں علماء کے سائے سے بھاگتا تھا۔ ان سے ملتا رہا۔ ان کی کتابیں بھی پڑھتا رہا لیکن اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا۔ اصلاحی اثر پڑا تو انہیں لوگوں کا جن کے نام ابھی عرض ہو چکے ہیں۔

کاش یہ ایک چھوٹی سی، ننھی سی آپ بیتی دوسروں کے لیے سبق کا کام دے!

ضمیمہ نمبر (۲)

سفر اور سفر آخرت[۱]

ہندوستان سے پاکستان جانے (براہ لاہور و کراچی) کا سفر اختیار کرنے کا موقع پہلی بار اس اپریل ۱۹۵۵ء میں پیش آیا۔ لکھنؤ سے امرت سر تک چین ہی چین رہا۔ اٹاری سرحد ہند کا آخری اسٹیشن ہے۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن یہاں ٹرین کے بڑے چھوٹے سارے مسافروں کو مع چھوٹے سے چھوٹے سامان کے اترنا پڑا اور گاڑی ایک دم سے خالی کرنا پڑی جانچ ہر مسافر کے پاسپورٹ کی ہوئی اور جائزہ (Checking) ہر ایک کے سامان کا لیا گیا کہ کہیں کوئی ناجائز چیز تو ساتھ نہیں جارہی ہے اور ایک لمبی مدت خاصے اضطراب میں گزری —— اللہ اکبر! منظر انسان کے سفر آخرت سے کتنا مشابہ تھا سفر حیات کی آخری منزل میں بھی) آفکر کی چیز اور کام آنے والی چیز تو یہی ایمان کا پروانۂ راہ داری ہوگا! جس نے اس کو سلامت رکھا وہ کس طرح بے کھٹکے عالم ناسوت کو عبور کر کے دار آخرت میں پہونچ جائے گا اور جس نے اپنے اعمال کو کفر و نفاق کی غل و غش سے پاک و صاف رکھا اسے یہ بوجھ کوئی بوجھ ہی نہ معلوم ہوگا۔ اور وہ کس طرح ہلکا پھلکا رضوان الٰہی کی مملکت میں داخل ہو جائے گا۔

گاڑی تیزی سے بڑھتی اڑتی اور درمیان کے ایک آدھ اسٹیشن چھوڑ چلی گئی یہاں تک

---

[۱] منقول از صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۵۵ء

پاکستان کا جانچ والا (Chic King) اسٹیشن جلد آ گیا اور یہ پتہ بھی نہ چلنے پایا کہ ٹھیک کس وقت مسافر ایک ملک سے دوسری میں منتقل ہو آیا۔ اس ملک کے آئین و قوانین جداگانہ احکام جداگانہ، دین و ملت جداگانہ لیکن مسافر کو خبر بھی نہیں ہونے پائی کہ وہ آناً فاناً کس طرح ایک ملک سے دوسرے میں منتقل ہو آیا ہے! — ناسوتی زندگی سے آخرتی زندگی میں انتقال کو جن لوگوں نے لازمی طور پر سخت تکلیف دہ سمجھ رکھا ہے وہ اس نظیر کو نظر میں رکھیں۔ اللہ کا فضل و کرم اگر شامل ہو اور انسان ایمان کے کیل کانٹے سے درست ہے تو یہ کسی طرح محسوس بھی نہ ہونے پائے گا کہ روح کی ناسوتی منزل ختم کس وقت ہوئی اور روح اس عالم کیف و کم سے نکل کر عالم مجردات میں داخل کس گھڑی ہو گئی!